زیر سرپرستی

جاوید احمد غامدی

ریاست ہائے متحدہ امریکہ

ماہنامہ

# اشراق

جنوری 2025ء

مدیر: سید منظور الحسن

اشراق آڈیو

مدیر آڈیو: محمد حسن الیاس

www.ghamidi.org

غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ، المورد امریکہ

# اشراق

ماہنامہ

ریاست ہائے متحدہ امریکہ

جلد ۳ شمارہ ۱ جنوری ۲۰۲۵ء رجب / شعبان ۱۴۴۶ھ



زیر سرپرستی

جاوید احمد غامدی

مدیر

سید منظور الحسن

مدیر آڈیو اشراق: محمد حسن الیاس

معاون مدیر: شاہد محمود

مجلس تحریر:

ریحان احمد یوسفی، ڈاکٹر عمار خان ناصر، ڈاکٹر محمد عامر گزدر

ڈاکٹر عرفان شہزاد، محمد ذکوان ندوی، نعیم بلوچ


## فہرست


**شذرات**

زوجین — جاوید احمد غامدی — 3

ایمانیات میں کیا شامل ہے اور کیا شامل نہیں ہے؟ — سید منظور الحسن — 6

مسئلۂ فلسطین اور مذہبی قیادت کا کردار — محمد حسن الیاس — 11

**قرآنیات**

البیان: البقرہ 2: 224-232 (17) — جاوید احمد غامدی — 18

**معارف نبوی**

احادیث — جاوید احمد غامدی / محمد حسن الیاس — 22

**مقامات**

عالمی دعوت — جاوید احمد غامدی — 24



www.ghamidi.org

غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ، المورد امریکہ

**دین و دانش**

شق القمر: غامدی صاحب کا موقف (18) — سید منظور الحسن — 28

**آثارِ صحابہ**

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا علم و عمل بہ طور اسوہ (4) — ڈاکٹر عمار خان ناصر — 37

**نقطۂ نظر**

"23 اعتراضات سیریز" — تصنیفی کام کا طریقۂ کار — سید منظور الحسن — 51

جنس یا انسان — محمد ذکوان ندوی — 62

علاماتِ قیامت: کون سی پوری ہو گئیں اور کون سی باقی — عدنان اعجاز — 64

**مختارات**

'اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ' کی شان نزول کی تحقیق (2) — علامہ شبیر احمد ازہر / غطریف شہباز ندوی — 73

پاکستانی معاشرتی رویے: برداشت، اختلاف اور انتہا پسندی — ثاقب علی — 79

**مکالمات**

مطالعۂ سنن ابن ماجہ (1) — ڈاکٹر عمار خان ناصر / ڈاکٹر سید مطیع الرحمن — 82

دین میں ڈاڑھی کا تصور — محمد حسن الیاس / شاہد رضا — 93

**تراجم**

قضیۃ الالحاد — غطریف شہباز ندوی — 101

**سیر و سوانح**

حیاتِ امین (17) — نعیم احمد بلوچ — 109

**ادبیات**

ہم نے مانا کہ یہاں اب کوئی بیداد نہیں — جاوید احمد غامدی — 114

**حالات و وقائع**

خبر نامہ "المورد امریکہ" — شاہد محمود — 115

جاوید احمد غامدی

# زوجین

یہ صرف مرد و عورت نہیں ہیں، جنھیں زوجین کی صورت میں پیدا کیا گیا ہے۔ قرآن نے صراحت فرمائی ہے کہ اِس دنیا کی ہر چیز اِسی طرح پیدا ہوئی ہے، لہٰذا سب جوڑا جوڑا ہیں، الاّ یہ کہ وہ اِنھی میں سے کسی جوڑے کے تکملہ اور تتمہ کے طور پر پیدا کی گئی ہوں۔ انسان اگر دقت نظر کے ساتھ غور کرے تو دیکھ سکتا ہے کہ نفس اور مادہ ہو، نباتات و حیوانات ہوں، نوع انسانی ہو یا قرآن کی سورتیں، خدا کی مخلوقات میں ہر جگہ تزویج کا یہی اصول کار فرما ہے۔ یہاں تک کہ مادے کی بنیادی ترکیب میں بھی مثبت اور منفی برقی توانائی کا ربط و نظام ہی نتیجہ خیز ہو رہا ہے۔ پھر یہی نہیں، اِس سے آگے دیکھیے تو فرد اجتماع کے ساتھ، محنت سرمایے کے ساتھ، علل اپنے معلولات کے ساتھ، قوی آلات کے ساتھ، طبائع ارادوں کے ساتھ اور ارواح بھی اِسی طرح اپنے اجسام کے ساتھ جڑے ہوئے زوجین ہی کی صورت میں نظر آئیں گے۔ چنانچہ فرمایا ہے:

وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ، لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ.

”اور ہم نے ہر چیز کے جوڑے بنائے ہیں تاکہ تم یاد دہانی حاصل کرو۔“

(الذاریات 49:51)

مدعا یہ ہے کہ جب دنیا کی ہر چیز جوڑا جوڑا ہے اور اِسی حیثیت سے اپنی معنویت کا اظہار کرتی ہے تو خود دنیا کو بھی اپنا جوڑا چاہیے، جس سے وہ ایک بامقصد اور بامعنی چیز بنے۔ قرآن جس

آخرت کی منادی کرتا ہے، یہ اُس کے وجوب پر قرآن کا استدلال ہے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ اُس نے اِسی مقصد سے اِس حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے، لیکن غور کیجیے تو ایک دوسری حقیقت بھی اِس کے نتیجے میں آپ سے آپ واضح ہوتی ہے، اور وہ یہ کہ انسان کی تمام تگ و دو کا ہدف اُس کی دنیوی زندگی میں بھی یہی ہونا چاہیے کہ وہ ہر شے، ہر فکر، ہر حرکت اور ہر خیال کے زوجین دریافت کرے، پھر دیکھے کہ وہ کس لحاظ سے زوج زوج ہوئے ہیں، اُن کے مابین کیا پہلو تضادات کے اور کیا توافق کے ہیں، وہ ایک دوسرے کے ساتھ کس طرح ہم آہنگ ہوتے اور نئے زوجین کے تولد کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ مرد و عورت کے باہمی تعلق سے جو معاشرت پیدا ہوتی ہے، اُس میں بھی زوجین کے اِس تعلق کو سمجھنا ضروری ہے۔ فرد اور اجتماع کے تعلق سے جو سیاست وجود میں آتی ہے، اُس کا بھی یہی تقاضا ہے۔ محنت اور سرمایہ جس معیشت کو وجود میں لاتے ہیں، اُس کا فہم بھی اِسی پر منحصر ہے۔

یہ کوئی جدلیات نہیں ہے، جسے بعض فلسفیوں نے دریافت کر لینے کا دعویٰ کیا ہے۔ یہ زوج کے اندر زوج کی طلب ہے، جو اُنھیں زوجین بن جانے کے لیے مجبور کر دیتی، اور اِس طرح تضادات سے توافق اور توافق سے تضادات کی صورت میں نئے زوجین پیدا کرتی چلی جاتی ہے۔

دنیا کی فطرت یہی ہے۔ اِس کو سمجھے بغیر اگر علم و عمل کا کوئی نظریہ قائم کرنے کی کوشش کی جائے گی تو اُس کا حاصل محض انتہا پسندی ہو گی۔ سوشلزم، کمیونزم، فاشزم اور اب فیمنزم وغیرہ، یہ سب اِسی کی مثالیں ہیں۔ فلسفہ کے مختلف مدارس کا مطالعہ کیجیے تو وہاں بھی یہی صورت نظر آتی ہے۔ اِس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ زندگی کا حسن توازن ہے اور یہ اُسی وقت پیدا ہوتا ہے، جب ہم چیزوں کو اُن کی منفرد صورت میں دیکھنے کے بجاے اُنھیں زوجین کی صورت میں دیکھیں۔ پھر جو تعلق اُن میں پیدا ہوا ہے، اُس کو سمجھیں کہ اُس کی نوعیت کیا ہے، پھر اُسی کے مطابق اُن سے معاملہ کرنے کی سعی کریں۔

یہی علم حقیقی ہے، جو دنیا اور آخرت، دونوں میں انسان کو صلاح و فلاح سے ہم کنار کر دیتا ہے۔ خدا کی شریعت اِسی علم کو لے کر نازل ہوئی ہے۔ چنانچہ اِسی بنا پر فرمایا ہے کہ تمھارے پروردگار نے جب اِس کائنات کو بنایا تو اُس میں میزان قائم کر دی، اِس لیے کہ لوگ بھی اپنے دائرۂ اختیار میں اِسی طرح میزان قائم رکھیں۔ اہل ایمان کے لیے قیام بالقسط کا حکم، جسے قرآن

میں ایمان کا لازمی تقاضا قرار دیا گیا ہے، اِسی ہدایت کی ایک تعبیر ہے:

وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ، اَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيْزَانِ، وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ.

(الرحمٰن 55:9-7)

”اور اُس نے آسمان کو اونچا کیا اور اُس میں میزان قائم کر دی کہ (اپنے دائرۂ اختیار میں) تم بھی میزان میں خلل نہ ڈالو اور انصاف کے ساتھ سیدھی تول تولو اور وزن میں کمی نہ کرو۔“

سید منظور الحسن

# ایمانیات میں کیا شامل ہے اور کیا شامل نہیں ہے؟

ہمارے علما قرآن و حدیث میں مذکور بعض تصورات، واقعات اور پیشین گوئیوں کو ایمانیات کے زمرے میں شامل کرتے ہیں۔ گویا اُن کے نزدیک اُن کی نوعیت توحید، رسالت اور آخرت جیسے عقائد کی طرح ہے، جن پر ایمان لانا ضروری ہے۔ استاذِ گرامی جناب جاوید احمد غامدی کے نزدیک ایسا کرنا دین کے عرف کے خلاف ہے۔ اِس کے نتیجے میں مشمولاتِ دین کی درجہ بندی مجروح ہوتی ہے اور وہ چیزیں ایمانیات کا درجہ پا لیتی ہیں، جو محل تدبر ہیں اور جن میں فہم اور تاویل کا اختلاف ممکن ہیں۔

اُن کے موقف کی تفصیل درجِ ذیل ہے۔

ایمان سے مراد یہ ہے کہ انسان کسی بات کو پورے یقین قلب کے ساتھ مان لے۔ اِس کی اصل اللہ پر ایمان ہے، مگر اپنی تفصیل کے لحاظ سے یہ درج ذیل پانچ چیزوں سے عبارت ہے:

1۔ اللہ پر ایمان، یعنی ہم بغیر کسی شائبۂ شرک کے اپنے آپ کو پورا کا پورا اپنے پروردگار کے حوالے کر دیں۔

2۔ فرشتوں پر ایمان، یعنی یہ مانیں کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کی ایک معصوم اور قدسی صفت مخلوق ہیں، اُس کی ہدایت انسانوں کو پہنچاتے ہیں، اُس میں پوری طرح امین اور قابل اعتماد ہیں اور قضاو قدر کے فیصلے اُن کے ذریعے سے نافذ کیے جاتے ہیں۔

3۔ نبیوں پر ایمان، یعنی یہ تسلیم کر لیں کہ انبیا انسانوں کے لیے خدا کی طرف سے مامور اور واجب الاطاعت ہادی ہیں، اُن کا علم بے خطا ہے، اُن کا عمل زندگی کے لیے اسوہ ہے اور اُن کی اطاعت، اتباع اور محبت ہر شخص کے لیے ضروری ہے۔

4۔ کتابوں پر ایمان، یعنی اِس بات پر ایمان لائیں کہ انبیا علیہم السلام جس چیز کو کتاب الٰہی کی حیثیت سے پیش کر رہے ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کا اتارا ہوا صحیفۂ ہدایت ہے۔ اللہ نے اُسے حق و باطل کے لیے کسوٹی بنا کر نازل کیا ہے اور اِس لیے نازل کیا ہے کہ دین کے معاملے میں لوگ ٹھیک انصاف پر قائم ہو جائیں۔

5۔ روزِ جزا پر ایمان، یعنی اِس بات کو تسلیم کریں کہ مرنے کے بعد ہم لازماً اٹھائے جائیں گے، ایمان و عمل صالح کے سوا وہاں کوئی چیز اُن کے کام نہ آئے گی، اپنے ہر قول و فعل کے لیے خدا کے سامنے جواب دہ ہوں گے اور اذنِ خداوندی کے بغیر وہاں کسی کو یارا نہ ہو گا کہ اُن کے حق میں ایک لفظ بھی کہہ دے۔[1]

ارشاد فرمایا ہے:

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ ۟ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۟ وَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا ۗ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ. (البقرہ 2:285)

”ہمارے پیغمبر نے تو اُس چیز کو مان لیا جو اُس کے پروردگار کی طرف سے اُس پر نازل کی گئی ہے، اور اُس کے ماننے والوں نے بھی۔ یہ سب اللہ پر ایمان لائے، اور اُس کے فرشتوں اور اُس کی کتابوں اور اُس کے پیغمبروں پر ایمان لائے۔ (اِن کا اقرار ہے کہ) ہم اللہ کے پیغمبروں میں سے کسی کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے اور اِنھوں نے کہہ دیا ہے کہ ہم نے سنا اور سر اطاعت جھکا دیا۔ پروردگار، ہم تیری مغفرت چاہتے ہیں اور (جانتے ہیں کہ)

---

[1]۔ ماخوذ از ”البیان“ 1/ 181-178۔

ہمیں لوٹ کر تیرے ہی حضور میں پہنچنا ہے۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایمان باللہ ہی کی ایک فرع ـــ تقدیر کے خیر و شر ـــ کو اِن میں شامل کر کے اِنھیں اِس طرح بیان فرمایا ہے:

الإیمان أن تؤمن باللّٰہ، وملئکتہ، وکتبہ، ورسلہ، والیوم الاٰخر، و تؤمن بالقدر خیرہ وشرہ. (مسلم، رقم 102)

"ایمان یہ ہے کہ تم اللہ کو مانو اور اُس کے فرشتوں، اُس کی کتابوں اور اُس کے رسولوں کو مانو، اور آخرت کے دن کو مانو، اور اپنے پروردگار کی طرف سے تقدیر کے خیر و شر کو بھی۔"[2]

اِس سے واضح ہے کہ دین میں جن چیزوں کو ایمان و عقیدے کا درجہ حاصل ہے، وہ یہی پانچ ہیں۔ اِن کے علاوہ دیگر اجزاے دین کو ایمانیات کے زیرِ عنوان بیان کرنا درست نہیں ہے۔ جب اللہ اور اللہ کے رسول نے ایمانیات کے موضوعات کی تعیین کر دی ہے تو ہمیں اِس میں ترمیم و اضافے کا کوئی حق نہیں ہے۔

لہٰذا مثال کے طور پر ہم نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج و عمرہ اور قربانی کو عبادات کے زمرے میں شامل کریں گے؛ جہاد اور حدود و تعزیرات کے لیے قانون اور شریعت کی تعبیرات اختیار کریں گے؛ عاد و ثمود کی ہلاکت، اصحاب کہف اور ذوالقرنین کے واقعات کو اخبارِ ماضیہ قرار دیں گے؛ فتح مکہ اور رومیوں کی فتح کو پیشین گوئیاں کہیں گے اور ظہورِ دجال، نزولِ مسیح اور یاجوج و ماجوج کے خروج کو علاماتِ قیامت کے زیرِ عنوان بیان کریں گے۔ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے اِن چیزوں کی نسبت متحقق ہے تو ہم کسی شک و شبہے کے بغیر اِنھیں تسلیم کریں گے اور اِن کے انکار کو ایمان کے منافی قرار دیں گے، مگر اِن کے لیے ایمانیات کی تعبیر اختیار نہیں کریں گے۔

اِس بات کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ قرآن مجید کے وہ مندرجات جو محل تدبر ہیں اور جن کے بارے میں تاویل یا تعبیر کا اختلاف ممکن ہے، اُنھیں ایمانیات کے زمرے میں شامل کرنے

---

[2]۔ ماخوذ از "میزان" 76۔

سے علمی لحاظ سے دو مسئلے پیدا ہوتے ہیں۔

ایک زاویے سے دیکھا جائے تو ایمانیات کا دائرہ محل بحث میں آجاتا ہے۔ ایمانیات دین کی اساسات ہیں اور اِن پر بحث و نظر اور اختلاف کی گنجایش تسلیم کرنا دین کی بنیادوں کو مقام نزاع میں لانے کے مترادف ہے۔ چنانچہ اگر اخبار و اطلاعات کی اختلافی چیزوں کو ایمانیات کے زمرے میں شامل کیا جائے گا تو گویا ایمانیات کے اصل مباحث پر بحث و نزاع کا دروازہ کھول دیا جائے گا۔ مثال کے طور پر ختم نبوت کا تصور ایمان بالرسالت کا حصہ ہے۔ اِس پر بلا چون و چرا ایمان لانا ضروری ہے۔ اِس سے انحراف ایمان سے انحراف ہے۔ ایمان پر قائم رہتے ہوئے اِس پر بحث و نزاع کی کوئی گنجایش نہیں ہے۔ لیکن اگر مثال کے طور پر علاماتِ قیامت ـــــ لونڈی کے اپنی مالکہ کو جننے، عربوں کا عمارتیں بنانے میں مقابلہ کرنے، سورج کے مغرب سے طلوع ہونے، زمین سے کسی خاص جانور کے پیدا ہونے ـــــ جیسے قابل تاویل اخبار کو ایمانیات کی فہرست میں شامل کیا جائے گا تو اِن کے ساتھ نبوت اور ختمِ نبوت جیسے اصل ایمانیات کو بھی قابل تاویل سمجھا جانے لگے گا۔

اِس کے برعکس، اگر دوسرے زاویے سے دیکھا جائے تو اخبار و اطلاعات کی نوعیت کی چیزوں کو ایمان کا درجہ دینے سے اُن کے بارے میں غور و فکر اور اختلاف رائے کا جواز ختم ہو جائے گا۔ گویا اگر کوئی محدث یا مفسر اُنھیں قبول نہیں کرے گا یا اُن کی مختلف تاویل کرے گا تو اُس کے عقیدہ و ایمان پر سوال کھڑا ہو جائے گا۔

اِس بات کو چند مثالوں سے سمجھ لیجیے۔ یہ سوال کہ قرآن میں 'غیر المغضوب علیھم ولا الضالین' کا مصداق کون لوگ ہیں یا یہ سوال کہ جس 'شجرۃ' سے حضرت آدم علیہ السلام کو منع کیا گیا تھا، اُس سے کون سا درخت مراد ہے، بحث و تمحیص کا موضوع بن سکتا ہے۔ اِس نوعیت کے مباحث علمی مباحث ہیں، جن کے فہم میں علما کے مابین اختلاف ہو سکتا ہے اور اکثر ہوا بھی ہے۔ ذوالقرنین اور حضرت خضر کے اخبار کا معاملہ بھی یہی ہے۔ ذوالقرنین کے معنی ہیں: دو سینگوں والا، مگر اِس کا مصداق کون سی شخصیت ہے، اِس کے بارے میں قرآن خاموش ہے۔ چنانچہ بعض علما اُسے اسکندرِ اعظم سمجھتے ہیں، بعض کے نزدیک یہ یمن کا ایک بادشاہ تھا اور بعض اِسے ایرانی بادشاہ خسرو قرار دیتے ہیں۔ حضرت خضر کے حوالے سے بھی تین آرا نمایاں ہیں: ایک کے مطابق وہ

فرشتہ تھے، دوسری کے مطابق پیغمبر تھے اور تیسری کے مطابق ولی تھے۔ اِس نوعیت کا علمی اختلاف، ظاہر ہے کہ ایمانیات کو متاثر نہیں کرتا، لیکن اگر ہم اِس طرح کے اخبار کو من جملۂ ایمانیات قرار دیں گے تو پھر بہ صورتِ اول اِن پر بحث کا دروازہ بند ہو جائے گا اور بہ صورتِ ثانی اختلاف کرنے والے مفسرین اور شارحین کے بارے میں ایمانیات کے انکار کا الزام قائم ہو جائے گا۔ اِس کے نتیجے میں یہ سلسلہ بھی شروع ہو سکتا ہے کہ اصحاب علم کی طرف سے ایمانیات کے زیرِ عنوان الگ الگ فہرستیں جاری ہونا شروع ہو جائیں اور مسلمہ اور متفق علیہ ایمانیات کا مقام و مرتبہ مجروح ہونا شروع ہو جائے۔

چنانچہ یہ ضروری ہے کہ ایمانیات کو اِس طرح کی بحث و نزاع سے مستقل طور پر بالاتر رکھا جائے۔

محمد حسن الیاس

# مسئلۂ فلسطین اور مذہبی قیادت کا کردار

مسئلۂ فلسطین بنیادی طور پر ایک سیاسی اور جغرافیائی تنازع تھا، جو وقت کے ساتھ مسلمانوں کے لیے ایک مذہبی اور جذباتی وابستگی کی بنیاد بن چکا ہے۔ اس تناظر میں، مذہبی قیادت نے گذشتہ کئی دہائیوں سے اس مسئلے میں نمایاں کردار ادا کرتے ہوئے اسے ایک خاص زاویے سے پیش کرنے کا رجحان پیدا کیا۔ اس بیانیے نے سیاسی تنازعات کو مذہبی تناظر میں ڈھال دیا، جس کے نتیجے میں مسلم دنیا کو خوں ریزی، سیاسی عدم استحکام اور معاشی مشکلات جیسے سنگین مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔

اس بیانیے کے اثرات نے عالمی طاقتوں کے ساتھ مسلم دنیا کے تعلقات کو بھی خراب کیا اور ''تہذیبوں کے تصادم'' کا تاثر پیدا کیا۔ نتیجتاً، عالمی طاقتوں نے مسلمان مذہبی قیادت پر اعتماد کرنے سے گریز کیا اور انھیں عالمی امن کے لیے ایک ممکنہ خطرہ سمجھا۔ مزید برآں، وقت نے یہ ثابت کر دیا کہ مسلمانوں کے پاس جو کچھ تھا، وہ غیر موثر حکمت عملیوں اور جذباتی بیانیوں کی بھینٹ چڑھ گیا۔ یہ صورت حال درحقیقت مذہبی قیادت کے بیانیے کی مکمل ناکامی کی عکاس ہے۔

اس لیے یہ ضروری ہے کہ مذہبی قیادت کے رویوں کا ایک حقیقت پسندانہ تجزیہ کیا جائے۔ ان رویوں کی بنیاد تین بنیادی نکات کی غلط تفہیم پر ہے، جو نہ صرف فلسطینی جدوجہد، بلکہ مسلم دنیا کے مجموعی تشخص کو بھی ہر پہلو سے متاثر کر چکے ہیں۔

یہ تینوں رویے درج ذیل ہیں۔

1۔ سیاسی تنازعات کو مذہبی تناظر میں دیکھنا:

مسلم مذہبی قیادت نے فلسطین کے مسئلے کو خالص مذہبی فریم ورک میں پیش کیا، جس نے اسے ایک مذہبی جنگ بنا دیا۔

2۔ آئیڈیلزم کی بنیاد پر عالمی طاقتوں سے معاملہ کرنا:

عالمی سیاست کی عملی حقیقتوں کو نظر انداز کیا گیا اور مسئلۂ فلسطین کو تاریخ اور خالص انصاف کے اصولوں کی بنیاد پر پیش کیا گیا۔

3۔ عظمت رفتہ کی بازیافت اور زوال کا انکار:

اسلامی خلافت کے احیا اور عالمی طاقت بننے کے خواب کے زیر اثر، زمینی حقائق کو مکمل نظر انداز کیا گیا۔

## سیاسی تنازعات کو مذہبی جدوجہد کے طور پر پیش کرنا

مذہبی قیادت نے فلسطینی تنازع کو ہمیشہ ایک مقدس جدوجہد کے طور پر پیش کیا ہے، جہاں یروشلم اور مسجد اقصیٰ کی مذہبی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے عوامی حمایت حاصل کی گئی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے تاریخی معاہدے اور اسلامی تاریخ کے دیگر حوالوں کو استعمال کرتے ہوئے مسئلے کو ایک مذہبی فرض کے طور پر پیش کیا گیا، جس نے عوام کو متحرک کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس بیانیے کا سب سے اہم منفی پہلو یہ رہا ہے کہ اس نے تنازع کی دیگر اہم جہتوں، جیسے انسانی حقوق اور سماجی انصاف کو نظر انداز کر دیا۔ خالصتاً مذہبی بیانیے نے اس مسئلے کو بین الاقوامی سطح پر انسانی حقوق کے بیانیے میں ڈھالنے کی سیاسی قیادت کی کوششوں کو ہر مرحلے پر نقصان پہنچایا۔ معروف مورخ برنارڈ لیوس کے مطابق، سیاسی تنازعات کو مذہبی دائرۂ کار میں محدود کر دینے سے یہ تنازع ایک عالمی انسانی مسئلے کے بجائے علاقائی مذہبی تصادم کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

مزید برآں، مذہبی بیانیہ ہیومن ازم کے پس منظر میں وجود پذیر ہونے والی مغربی تہذیب کی کسی حمایت سے یکسر محرومی ہے۔

ایڈورڈ سعید نے اپنی کتاب میں یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ فلسطینی کاز کو ایک انسانی حقوق کے مسئلے کے طور پر پیش کرنے سے مختلف ثقافتوں اور قوموں کو اس مسئلے کے ساتھ جوڑنے کے مواقع بڑھ سکتے تھے، لیکن مذہبی رنگ دینے کی وجہ سے یہ مسئلہ بین الاقوامی برادری

کے ایک بڑے حصے کے لیے غیر متعلقہ بن گیا۔

اسی سلسلے میں کیرن آرمسٹرانگ کا موقف بھی ایک گہرے نفسیاتی اور سماجی زاویے کو پیش کرتا ہے، جہاں وہ مذہب کو تنازعات کے پس منظر میں دیکھتی ہیں۔ ان کے مطابق، جب کوئی تنازع مذہبی حیثیت اختیار کر لیتا ہے تو یہ مسئلے کو غیر معمولی شدت اور پیچیدگی عطا کرتا ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ مذہبی تنازعات میں دونوں فریق اپنے موقف کو "حق و باطل" کی جنگ کے طور پر دیکھتے ہیں۔ یہ سوچ سمجھوتے اور مصالحت کی گنجایش کو ختم کر دیتی ہے اور تنازعات کو طول دینے کے ساتھ مزید خراب کر دیتی ہے۔

ارض فلسطین کے تاریخی پس منظر کو دیکھتے ہوئے، یہ بات واضح ہے کہ اس زمین سے مسلمانوں کے تعلق کی طرح یہود کا تعلق بھی نہایت قدیم اور گہرا ہے۔ تاہم، اسرائیل کا قیام کسی مذہبی فتح کا نتیجہ نہیں، بلکہ عالمی فاتحین کے فیصلوں کا نتیجہ تھا۔ غور کیا جائے تو دنیا کے بیش تر ممالک کی سرحدیں انصاف یا تاریخ کے اصولوں پر نہیں، بلکہ سیاسی مصلحتوں کی بنیاد پر طے کی گئی ہیں۔ ارض فلسطین میں یہود کو آباد کرنے کا فیصلہ بھی ان عالمی قوتوں نے کیا، جو اس خطے پر حکمران تھیں۔ اس فیصلے کو عالمی برادری نے قبول کیا اور یوں یہ معاملہ سیاسی حقیقت بن گیا۔

اس تنازع کے دو بنیادی فریق تھے: ایک طرف فلسطین کی مذہبی قیادت اور دوسری طرف عالمی سیاسی قوتیں اور ان کے پس منظر میں موجود عالمی برادری۔ بدقسمتی سے فلسطین کی مذہبی قیادت ان فریقوں کی صحیح پہچان کرنے میں ناکام رہی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جس دشمن کو شکست دینے کا خواب دیکھا گیا، وہ کوئی ایک ملک یا سرحد میں محدود فریق نہیں، بلکہ ایک وسیع عالمی نظام اور طاقت ہے، جو دنیا پر حکمرانی کر رہا ہے۔

یہ صورت حال اس بات کو اجاگر کرتی ہے کہ تنازعات کو مذہبی رنگ دینے کے بجاے عملی اور سیاسی تناظر میں دیکھا جائے۔ کیونکہ سیاسی تنازعات میں مذہب کا عمل دخل نہ صرف مصالحت اور افہام و تفہیم کو مشکل بنا دیتا ہے، بلکہ مسائل کو مزید پیچیدہ اور لاینحل بنا دیتا ہے۔

## آئیڈیلزم کی بنیاد پر عالمی طاقتوں سے معاملہ کرنا

فلسطینی قیادت کا دوسرا اہم مسئلہ یہ رہا ہے کہ انھوں نے عالمی طاقتوں کے ساتھ غیر حقیقت

پسندانہ اور مثالی بنیادوں پر توقعات وابستہ کر لیں۔ مذہبی قیادت اور فلسطینی رہنماؤں نے انصاف، اخلاقیات اور تاریخی حقوق کی بنیاد پر اپنے موقف کو پیش کیا، جو اصولی طور پر درست ہونے کے باوجود بین الاقوامی سیاست کی حقیقتوں سے مطابقت نہیں رکھتا۔

بین الاقوامی تعلقات میں طاقت اور مفادات کا بنیادی کردار ہوتا ہے، جو محض اخلاقی دلائل سے متاثر نہیں ہوتے۔ مثال کے طور پر 1948ء کی جنگ کے بعد اسرائیل نے مغربی دنیا، خاص طور پر امریکہ اور یورپ کی حمایت حاصل کی، جنھوں نے اسے ایک اسٹریٹیجک اتحادی کے طور پر دیکھا۔ یہ مشرق وسطیٰ میں مغربی مفادات کے تحفظ کے حوالے سے ریاست کے ذریعے سے خطے پر اثر ورسوخ بڑھانے کی ایک حکمت عملی تھی۔

اس کے برعکس، فلسطینی قیادت نے سفارتی تعلقات کو مضبوط کرنے کے بجائے اصولی دلائل پر انحصار کیا۔ نوم چومسکی نے اس طرزِ عمل پر تنقید کرتے ہوئے کہا ہے کہ فلسطینی قیادت کو عالمی طاقتوں کے ساتھ بہتر تعلقات قائم کرنے کے لیے عملی اقدامات کرنے کی ضرورت ہے، جب کہ یہ معاملہ محض ناانصافی کے الزامات تک محدود رہا، جسے عالمی فاتحین نے کبھی درخود اعتنانہ سمجھا۔

یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ فلسطینی قیادت عالمی سیاست میں طاقت کے توازن کو سمجھنے میں مکمل ناکام نظر آئی، جس کی وجہ سے وہ دیگر طاقت ور ریاستوں، جیسے چین، روس اور غیر مغربی ممالک کی مکمل اور غیر مشروط حمایت حاصل کرنے میں ناکام رہی۔ ممتاز فلسطینی اسکالر رشید خالدی نے اپنے مقالات میں اس اہم نکتے پر روشنی ڈالی ہے کہ فلسطینی قیادت کو جنوبی افریقہ کی آزادی کی تحریک سے سبق سیکھنا چاہیے تھا۔ جنوبی افریقہ کی قیادت نے عالمی سفارتی تعلقات کی پیچیدگیوں کو سمجھتے ہوئے اپنے مقصد کے لیے عالمی حمایت کو متحرک کیا اور متوازن سفارتی حکمت عملی اپنائی۔ خالدی اس بات کی نشان دہی کرتے ہیں کہ فلسطینی تحریک نے اپنی کوششوں کو زیادہ تر مغربی دنیا کے ردعمل اور امداد پر مرکوز رکھا، جب کہ دیگر عالمی قوتوں کو اپنے موقف کے لیے قائل کرنے کی کوشش کم کی گئی۔ یہ ایک ایسی کمی تھی، جس نے فلسطینی تحریک کو سفارتی میدان میں بالکل محدود کر دیا۔

اگر فلسطینی قیادت عالمی طاقتوں کی متنوع حمایت کو بہتر طریقے سے منظم کرتی تو یہ ممکن تھا کہ وہ اپنے حقوق کے لیے ایک مضبوط اور موثر سفارتی محاذ بنا سکتی۔ ایسے ممالک جو نوآبادیاتی مظالم

سے گزرے ہیں، جیسے چین اور افریقی ممالک، فلسطینی کاز کے لیے زیادہ قابل بھروسا اتحادی ثابت ہو سکتے تھے، لیکن ان تعلقات کو مضبوط بنانے کے بجاے مذہبی قیادت نے مسلح جدوجہد کے ذریعے سے تبدیلی کا خواب دیکھا، جس کی وجہ سے فلسطینی قیادت کی جدوجہد عالمی سطح پر اتنی موثر نہ ہو سکی، جتنی کہ جنوبی افریقہ کی تحریک تھی۔

## عظمتِ رفتہ کی بازیافت اور زوال کا انکار

1948ء، 1967ء اور 1973ء کی جنگوں میں اسرائیل کے ہاتھوں شکست نے یہ واضح کر دیا تھا کہ موجودہ مزاحمتی حکمت عملیوں کے ذریعے سے طاقت کے توازن کو بدلنا ممکن نہیں۔ اس کے باوجود، فلسطینی مذہبی قیادت نے مسلح جدوجہد کو اپنی بنیادی حکمت عملی کے طور پر برقرار رکھا، حالاں کہ زمینی حقائق مسلسل یہ دکھا رہے تھے کہ طاقت کا توازن ہمیشہ اسرائیل کے حق میں رہا ہے۔ اس مزاحمت نے نہ صرف فلسطینی عوام کو بے پناہ جانی اور مالی نقصان پہنچایا، بلکہ اسرائیل کو اپنے اقدامات کا جواز فراہم کرنے کا موقع بھی دیا۔

اسی دوران میں اسرائیل نے سائنسی ترقی میں غیر معمولی کامیابیاں حاصل کیں، خاص طور پر ٹیکنالوجی، دفاع اور زراعت جیسے شعبوں میں۔ اسرائیل کی معیشت ''اسٹارٹ اپ نیشن'' کے طور پر دنیا میں اپنی جگہ بنا چکی ہے، جو اس کی تکنیکی برتری اور مضبوط معیشت کا ثبوت ہے۔ معروف فلسفی یووال نوح حراری کے مطابق، آج کی جنگوں اور طاقت کے توازن کا تعین ٹیکنالوجی اور مصنوعی ذہانت کی ترقی سے ہوتا ہے اور ان شعبوں میں مسلم دنیا کی موجودہ کارکردگی کا دیگر اقوام سے کوئی موازنہ ممکن نہیں۔

فلسطینی مذہبی قیادت نے طویل عرصے تک یہ خواب دیکھا کہ اگر تمام مسلم ممالک متحد ہو جائیں تو وہ اسرائیل کا خاتمہ کر سکتے ہیں۔ یہ قیادت فلسطینی عوام کو اس بات کا یقین دلاتی رہی کہ امت مسلمہ کی مشترکہ طاقت اسرائیل کو اسی طرح شکست دے سکتی ہے، جیسے ماضی میں مسلمانوں نے کئی اقوام کو شکست دی، لیکن زمینی حقائق اس کے بالکل برعکس ہیں۔ مسلم دنیا نہ صرف عالمی سیاست میں کم زور ہے، بلکہ اقتصادی، سائنسی اور عسکری شعبوں میں بھی مغربی دنیا اور اسرائیل کے مقابلے میں کہیں پیچھے ہے۔ اس خواب کی بنیاد پر عمل کرنا نہ صرف غیر حقیقت پسندانہ ثابت

ہوا، بلکہ اس نے مسلمانوں کو ان کی موجودہ حیثیت اور حقیقی مسائل کو سمجھنے سے بھی محروم رکھا۔

آج اسرائیل کی فی کس جی ڈی پی کئی مسلم ممالک سے زیادہ ہے اور اس کی معیشت بڑی عالمی طاقتوں کے ساتھ مضبوطی سے جڑی ہوئی ہے۔ دوسری جانب مسلم دنیا مجموعی طور پر عالمی معیشت میں محدود کردار ادا کرتی ہے اور بڑی طاقتوں پر انحصار کرتی ہے، جو اسرائیل کی حمایت میں اپنا موقف مضبوطی سے برقرار رکھتی ہیں۔ اس حقیقت کو نظر انداز کرتے ہوئے مذہبی قیادت نے عوام میں یہ تاثر قائم رکھا کہ مسلح جدوجہد ہی کامیابی کا واحد راستہ ہے، حالاں کہ موجودہ حالات میں فلسطینی کاز کی کامیابی کے لیے طاقت کے عالمی توازن کو تسلیم کرنا اور سائنسی و معاشی ترقی کے ذریعے سے اپنے وسائل کو مضبوط بنانا زیادہ ضروری تھا۔

مزید برآں، فلسطینی قیادت کی مسلح جدوجہد نے اسرائیل کو اپنے مقاصد کے لیے ایک نیا جواز فراہم کر دیا۔ اسرائیل نے اپنی بقا کے نام پر نہ صرف سرحدوں کی توسیع کا خواب دیکھا، بلکہ اس کے لیے عالمی حمایت بھی حاصل کی۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد عالمی طاقتوں نے موجودہ عالمی نظام کو تشکیل دیا اور ان طاقتوں نے اسرائیل کی بقا کو اپنی بنیادی ذمہ داریوں میں شامل کیا۔ نتیجتاً، ان طاقتوں نے فلسطینی مزاحمت کے ہر راستے کو روکنے کے لیے مکمل وسائل بروے کار لائے، جس سے فلسطینی عوام مزید مشکلات کا شکار ہوئے۔ اور فلسطینی مذہبی قیادت کا جذباتی بیانیہ اور عظمت رفتہ کی بازیافت کا خواب نہ صرف غیر حقیقت پسندانہ ثابت ہوا، بلکہ اس نے فلسطینی عوام کو عالمی حقائق کے مطابق موثر حکمت عملی اپنانے سے بھی روکا۔

ہمارے نزدیک مسئلۂ فلسطین کا المیہ صرف زمین اور اقتدار کی جنگ نہیں، بلکہ نسلوں کی بقا اور اس کے خوابوں کی تباہی کی کہانی ہے۔ مذہبی قیادت کے ان رویوں نے اسے اس نہج پر پہنچا دیا ہے، جہاں اب دو قومی ریاستی حل بھی ایک خواب بن چکا ہے۔ اسرائیل کے تمام توسیع پسندانہ اقدامات کو فلسطینی قیادت نے خود اپنی غیر حقیقت پسندانہ حکمت عملیوں کے ذریعے سے ایک عالمی جواز فراہم کیا۔ حماس کے حالیہ اقدامات نے اس صورت حال کو مزید سنگین بنا دیا ہے۔ اس کے نتیجے میں نہ صرف فلسطین کو ایک شدید اور تباہ کن حملے کا سامنا کرنا پڑا، بلکہ اسرائیل نے اس کی عملی حیثیت کو تقریباً مکمل طور پر ختم کر دیا ہے۔

ایران، لبنان اور شام جیسے روایتی حمایتی ممالک نے بھی عملی طور پر مذہبی قیادت سے اپنی

حمایت واپس لے لی ہے، جس نے فلسطینیوں کو مزید تنہا کر دیا ہے۔ یہ نسل کشی ایک الم ناک حقیقت ہے، جس کا سب سے بڑا سبق یہ ہے کہ مسلمان جو کچھ حاصل کر چکے تھے، اسے اپنی غلط تدابیر، عظمت کے زعم اور غیر موثر مسلح جدوجہد کی بھینٹ چڑھا بیٹھے۔

اب شاید دو ریاستی حل کا خواب بھی اپنی معنویت کھو چکا ہے اور امن کے امکانات ایک یک ریاستی حل میں سکڑ کر رہ گئے ہیں۔ یہ وقت ہے کہ جذباتی نعروں اور غیر حقیقت پسندانہ خوابوں کو ترک کر کے ایک ایسی حکمت عملی اپنائی جائے، جو فلسطینی عوام کی بقا، عزت اور مستقبل کو محفوظ کر سکے۔ یہ جنگ صرف زمین کی نہیں، بلکہ انسانیت کی ہے اور اس کا تقاضا ہے کہ عقل و تدبر کے ذریعے سے ایک نیا راستہ تلاش کیا جائے، ورنہ تاریخ کے صفحات پر فلسطینی قوم کی جدوجہد ایک اور الم ناک داستان کے طور پر رقم ہو جائے گی۔

## حوالہ جات:


1. Said, E. W. (1979). The question of Palestine. New York, NY: Vintage Books.

2. Lewis, B. (2003). The crisis of Islam: Holy war and unholy terror. New York, NY: Modern Library.

3. Chomsky, N. (1999). Fateful triangle: The United States, Israel, and the Palestinians (Updated ed.). Boston, MA: South End Press.

4. Khalidi, R. (2006). The iron cage: The story of the Palestinian struggle for statehood. Boston, MA: Beacon Press.

5. Harari, Y. N. (2014). Sapiens: A brief history of humankind. London, England: Harvill Secker.

# البیان

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

## سورۃ البقرۃ

(17)

وَ لَا تَجۡعَلُوا اللّٰهَ عُرۡضَةً لِّاَيۡمَانِكُمۡ اَنۡ تَبَرُّوۡا وَ تَتَّقُوۡا وَ تُصۡلِحُوۡا بَيۡنَ النَّاسِ ؕ وَ اللّٰهُ سَمِيۡعٌ عَلِيۡمٌ ﴿۲۲۴﴾ لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغۡوِ فِىۡۤ اَيۡمَانِكُمۡ وَلٰكِنۡ يُّؤَاخِذُكُمۡ بِمَا كَسَبَتۡ قُلُوۡبُكُمۡ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوۡرٌ حَلِيۡمٌ ﴿۲۲۵﴾ لِلَّذِيۡنَ يُؤۡلُوۡنَ مِنۡ نِّسَآئِهِمۡ تَرَبُّصُ اَرۡبَعَةِ اَشۡهُرٍ ۚ فَاِنۡ فَآءُوۡ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۲۲۶﴾ وَاِنۡ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيۡعٌ عَلِيۡمٌ ﴿۲۲۷﴾

---

(عورتوں سے متعلق بعض دوسرے معاملات بھی ہیں، اِنھیں بھی سمجھ لو) اور اپنی قسموں کے لیے اللہ کے نام کو دوسروں سے حسن سلوک کرنے اور حدود الٰہی کی رعایت کرنے اور لوگوں کے مابین صلح کرانے میں رکاوٹ نہ بناؤ اور (متنبہ رہو کہ) اللہ سمیع و علیم ہے۔ اللہ تمھاری اُن قسموں پر تو تمھیں نہیں پکڑے گا جو تم بے ارادہ کھا لیتے ہو، لیکن وہ قسمیں جو اپنے دل کے ارادے سے کھاتے ہو، اُن پر لازماً تمھارا مواخذہ کرے گا اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ بخشنے والا ہے، وہ بڑا بردبار ہے۔

وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ۭ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا ۭ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۠ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۲۸﴾

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۠ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ۭ وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْـــًٔا اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ۭ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ۚ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۲۹﴾

---

(اِس لیے) جو لوگ اپنی بیویوں سے نہ ملنے کی قسم کھا بیٹھیں، اُن کے لیے چار مہینے کی مہلت ہے۔ پھر وہ رجوع کر لیں تو بے شک، اللہ بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔ اور اگر طلاق کا فیصلہ کر لیں تو اللہ سے ڈرتے ہوئے کریں، اِس لیے کہ اللہ سمیع و علیم ہے۔ 227-224

اور (یہ دوسری صورت پیدا ہو جائے تو) جن عورتوں کو طلاق دی گئی ہو، وہ اپنے آپ کو تین حیض تک انتظار کرائیں۔ اور اگر وہ اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتی ہیں تو اُن کے لیے جائز نہیں ہے کہ جو کچھ اللہ نے اُن کے پیٹ میں پیدا کیا ہے، اُسے چھپائیں۔ اور اُن کے شوہر اگر معاملات کی اصلاح چاہیں تو اِس (عدت کے) دوران میں زیادہ حق دار ہیں کہ اُنھیں لوٹا لیں اور (یہ اِس لیے ہے کہ اِس میں تو شبہ نہیں کہ) اِن عورتوں کے لیے بھی اُسی طرح حقوق ہیں، جس طرح دستور کے مطابق اُن پر (شوہروں کے) حقوق ہیں، لیکن مردوں کے لیے (شوہر کی حیثیت سے) اُن پر ایک درجہ ترجیح کا ہے۔ (یہ اللہ کا حکم ہے) اور اللہ زبردست ہے، وہ بڑی حکمت والا ہے۔ 228

یہ طلاق (ایک رشتۂ نکاح میں) دو مرتبہ (دی جا سکتی) ہے۔ اِس کے بعد پھر بھلے طریقے سے روک لینا ہے یا خوبی کے ساتھ رخصت کر دینا ہے۔ اور رخصت کر دینے کا فیصلہ ہو تو تمھارے لیے جائز نہیں ہے کہ جو کچھ تم نے اِن عورتوں کو دیا ہے، اُس میں سے کچھ بھی اِس موقع پر واپس لو۔ یہ صورت، البتہ مستثنیٰ ہے کہ دونوں کو اندیشہ ہو کہ وہ حدود الٰہی پر قائم نہ رہ سکیں گے۔ پھر، (لوگو)، اگر تمھیں بھی اندیشہ ہو کہ وہ حدود الٰہی پر قائم نہیں رہ سکتے تو (شوہر کی دی ہوئی) اُن چیزوں کے معاملے میں اُن دونوں پر کوئی گناہ نہیں ہے جو عورت فدیے میں دے کر طلاق حاصل کر لے۔ یہ اللہ کے مقرر کردہ حدود ہیں، سو اِن سے آگے نہ بڑھو اور (جان لو کہ) جو اللہ کے حدود

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ؕ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَآ اِنْ ظَنَّآ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۰﴾

وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ ۪ وَّلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ؕ وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا ۠ وَّاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۳۱﴾

وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۲﴾

---

سے آگے بڑھتے ہیں، وہی ظالم ہیں۔229

پھر اگر (دو مرتبہ طلاق سے رجوع کے بعد) شوہر نے (اِسی رشتۂ نکاح میں) بیوی کو (تیسری مرتبہ) طلاق دے دی تو اب وہ اُس کے لیے جائز نہ ہو گی، جب تک اُس کے سوا کسی دوسرے شوہر سے نکاح نہ کرے۔ لیکن اگر اُس (دوسرے شوہر) نے بھی اُس کو طلاق دے دی تو پہلے میاں بیوی کے لیے ایک دوسرے کی طرف رجوع کر لینے میں کوئی مضایقہ نہیں ہے، اگر یہ توقع رکھتے ہوں کہ اب وہ حدود الٰہی پر قائم رہ سکیں گے۔ یہ اللہ کے مقرر کردہ حدود ہیں جنھیں وہ اُن لوگوں کے لیے واضح کر رہا ہے جو علم حاصل کرنا چاہتے ہوں۔230

اور جب تم عورتوں کو طلاق دو اور اُن کی عدت پوری ہونے کو آجائے تو اُنھیں بھلے طریقے سے روک لو یا بھلے طریقے سے رخصت کر دو اور اُنھیں نقصان پہنچانے کے ارادے سے ہرگز نہ روکو کہ اِس طرح اُن پر زیادتی کرو۔ اور (جان لو کہ) جو ایسا کرے گا، وہ اپنی ہی جان پر ظلم ڈھائے گا۔ اور اللہ کی آیتوں کو مذاق نہ بناؤ، اور اپنے اوپر اللہ کی عنایت کو یاد رکھو، اور اُس قانون اور حکمت کو یاد رکھو جو اُس نے تم پر اتاری ہے، وہ تمھیں اِس کی نصیحت کرتا ہے، اور اللہ سے ڈرتے رہو اور خوب جان رکھو کہ اللہ ہر چیز سے واقف ہے۔231

اور جب تم عورتوں کو طلاق دو اور وہ اپنی عدت پوری کر لیں تو اب اِس میں مانع نہ ہو کہ وہ اپنے ہونے والے شوہروں سے نکاح کر لیں، جب وہ دستور کے مطابق آپس میں معاملہ کرنے

کے لیے راضی ہو جائیں۔ یہ نصیحت تم میں سے اُن لوگوں کو کی جاتی ہے جو اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں۔ یہی تمھارے لیے زیادہ شایستہ اور زیادہ پاکیزہ طریقہ ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔232

[باقی]

ترجمہ و تحقیق: جاوید احمد غامدی / محمد حسن الیاس

## — 1 —

معاویہ بن حکم سلمی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں: میں نے عرض کیا: یارسول اللہ، ہم جاہلیت کے زمانے میں بعض کام کیا کرتے تھے۔ (اُنھی میں سے یہ بھی تھا کہ) ہم کاہنوں کے پاس جایا کرتے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''لیکن اب کاہنوں کے پاس مت جایا کرو۔'' کہتے ہیں کہ میں نے کہا: ہم برا شگون بھی لیا کرتے تھے۔ آپ نے فرمایا: یہ ایک خیال ہی ہوتا ہے جو تم میں سے کسی کے دل میں گزرتا ہے، مگر تمھیں یہ کسی کام سے روکے نہیں۔ میں نے عرض کیا: ہم میں سے کچھ لوگ خط بھی کھینچتے تھے۔ اِس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایک نبی بھی خط کھینچا کرتے تھے۔ جس کا خط اُس کے موافق ہو جائے، وہ یہ خط کھینچ لے۔ (مسلم، رقم 4140)

## — 2 —

زہری روایت کرتے ہیں کہ مجھے یحییٰ بن عروہ نے بتایا کہ اُنھوں نے عروہ سے سنا، وہ کہتے تھے کہ سیدہ عائشہ کا بیان ہے کہ کچھ لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کاہنوں کے بارے میں پوچھا تو آپ نے اُن سے کہا: ''وہ کچھ نہیں ہیں''۔ صحابہ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول، بعض اوقات وہ ایسی بات بھی تو کہہ دیتے ہیں جو سچی ثابت ہوتی ہے۔ آپ نے وضاحت فرمائی: یہ

ایک سچا کلمہ ہوتا ہے، جس کو جن اچک لیتا ہے اور اپنے دوست کے کان میں مرغ کی طرح قر قر کر کے ڈال دیتا ہے۔ اِس کے بعد یہ کاہن لوگ اُس میں سو سے زیادہ جھوٹ ملا دیتے ہیں۔
(مسلم، رقم 4142)

## 3

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اہلیہ ام المومنین سیدہ عائشہ روایت کرتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا کہ آپ نے فرمایا: فرشتے عنان میں اترتے ہیں، اور عنان ایک بادل ہے۔ پھر وہ اُن کاموں کا ذکر کرتے ہیں، جن کا فیصلہ آسمان میں ہو چکا ہوتا ہے۔ یہی موقع ہے، جب شیاطین اُدھر کان لگاتے اور اُسے سن لیتے ہیں۔ پھر یہ شیاطین کاہنوں کو الہام کر دیتے اور وہ اپنی طرف سے اُس کے ساتھ ملا کر سو جھوٹ مزید بولتے ہیں۔ (بخاری، رقم 2989)

**مقامات**

جاوید احمد غامدی

# عالمی دعوت

اسلام اِس کائنات کے پروردگار کی دعوت ہے۔ یہ دعوت پوری انسانیت کے لیے ہے اور سب سے پہلے انسان کے ابو الآبا آدم علیہ السلام کے ذریعے سے خود اُن کو اور اُن کی اولاد کو دی گئی تھی۔ قرآن نے بتایا ہے کہ اِس کے بعد اختلافات پیدا ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے ہر قوم میں اپنے رسول بھیجے اور اُن کے ذریعے سے یہ دعوت اُن کی قوموں تک پہنچائی، یہاں تک کہ حجت پوری ہو گئی اور سنت الٰہی کے مطابق جزا و سزا کا فیصلہ اُن قوموں کے لیے پورے انصاف کے ساتھ اِسی دنیا میں صادر کر دیا گیا۔ فرمایا ہے:

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ رَّسُوْلٌ، فَإِذَا جَآءَ رَسُوْلُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ. (یونس 47:10)

”ہر قوم کے لیے ایک رسول ہے۔ پھر جب اُن کا رسول آجاتا ہے تو اُن کے درمیان فیصلہ کر دیا جاتا ہے اور اُن پر کوئی ظلم نہیں کیا جاتا۔“

یہ پہلا مرحلہ تھا۔ اِس کے بعد دوسرا مرحلہ شروع ہوا، جس میں اللہ تعالیٰ نے اِس دعوت کو

بغیر کسی انقطاع کے نسلاً بعد نسلٍ دنیا کی سب قوموں تک پہنچانے کے لیے سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور اُن کی اولاد کو منتخب فرمایا۔ چنانچہ ابراہیم علیہ السلام کو ہدایت کی گئی کہ اِس مقصد کے لیے وہ اپنے ایک بیٹے اسمٰعیل کو جزیرہ نماے عرب اور دوسرے بیٹے اسحٰق کو کنعان میں، جسے اب فلسطین کہا جاتا ہے، آباد کریں، اِس کے ساتھ ہی فیصلہ کر دیا گیا کہ یہ دونوں علاقے اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے خاص کر لیے ہیں، لہٰذا اب یہ ارض مقدسہ ہیں اور اِن میں اسلام کے ماننے والوں کے سوا دوسرے لوگ کبھی مستقل طور پر آباد نہیں ہو سکیں گے۔ اولاد ابراہیم کا یہی انتخاب ہے، جس کے بارے میں فرمایا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰٓى اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ. (آل عمران 3:33)

”اِس میں شبہ نہیں کہ اللہ نے آدم اور نوح کو، اور ابراہیم اور عمران کے خاندان کو تمام دنیاوالوں پر ترجیح دے کر (اُن کی رہنمائی کے لیے) منتخب فرمایا۔“

اِس انتخاب کے بعد کم و بیش پانچ سو سال کے عرصے میں اسمٰعیل اور اسحٰق، دونوں کی اولاد نے انسانی تاریخ میں پہلی مرتبہ بڑی مسلمان قوموں کی صورت اختیار کر لی تو اللہ تعالیٰ نے بہ تدریج نبوت بھی اُنھی کے ساتھ خاص کر دی اور اُن کو حکم دیا کہ اللہ کے پیغمبر جس حق کی شہادت تم پر دیں گے، وہی شہادت تم دنیا کی باقی سب قوموں پر دیتے رہو گے۔ عالمی سطح پر اسلام کی دعوت کے لیے اب ہر قوم کی طرف الگ الگ پیغمبر بھیجنے کے بجاے یہی اہتمام ہے، جو کائنات کے پروردگار کی طرف سے کیا گیا ہے۔ اِن میں سے پہلی قوم ـــــ بنی اسمٰعیل ـــــ کا تعلق قبائلی تمدن سے تھا، اِس لیے وہاں جب شریعت دی گئی تو وہ بھی شخصی معاملات تک محدود رہی، مگر بنی اسحٰق کا معاملہ یہ نہیں تھا۔ وہ مصر کے شہری تمدن میں اور ایک بڑی ریاست کے تحت پلے بڑھے تھے، اور بعد میں بھی انجیر اور زیتون کی سرزمین میں یروشلم جیسے شہر اور اُس کے نواح میں آباد ہوئے تھے، لہٰذا اُنھیں تورات عطا ہوئی، جس میں اللہ تعالیٰ نے نظم اجتماعی کے بارے میں شریعت کے احکام بیان فرمائے، جس کے نتیجے میں اسلام کی تصویر ہر لحاظ سے مکمل ہو گئی۔

دنیا کی قوموں پر شہادت حق کی یہ ذمہ داری بنی اسحٰق نے کم و بیش پندرہ سو سال تک ہراول کی حیثیت سے اور نبیوں کی قیادت میں اٹھائے رکھی، مگر آخر میں جب اُنھوں نے یحییٰ علیہ السلام

جیسے پیغمبر کو قتل کر ڈالا اور اُن کے بعد سیدنا مسیح کو بھی قتل کر دینے کے درپے ہوئے تو اِس عظیم ذمہ داری سے معزول کر دیے گئے اور اللہ تعالیٰ نے فیصلہ سنا دیا کہ جو حیثیت اِس سے پہلے اُنھیں حاصل تھی، وہ اب بنی اسمٰعیل کو حاصل ہو گی۔ چنانچہ چھٹی صدی عیسوی میں اِسی مقصد سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی، جس کے نتیجے میں اسلام کی عالمی دعوت کا تیسرا اور آخری مرحلہ شروع ہوا۔ یہی مرحلہ اِس وقت جاری ہے۔ اِس کے لیے جو اسکیم اللہ تعالیٰ نے اختیار فرمائی، وہ یہ ہے:

اولاً، قرآن نازل کیا گیا۔ اِس سے پہلے جو کتابیں بنی اسحٰق کو دی گئی تھیں، اُن میں سے تورات زیادہ تر قانون اور انجیل حکمت کا بیان تھی۔ زبور سے متعلق بھی ہر صاحب علم جانتا ہے کہ وہ خداوند عالم کی تمجید کا مزمور ہے۔ لیکن قرآن کا معاملہ سب سے الگ ہے۔ وہ نہ صرف یہ کہ قانون و حکمت کا جامع ہے، بلکہ اِس کے ساتھ ایک صحیفۂ انذار و بشارت بھی ہے۔ چنانچہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ہدایت کی گئی کہ وہ اِسی کے ذریعے سے اپنے مخاطبین کو انذار کریں اور باقی دنیا کو بھی بتا دیا گیا کہ وہ 'لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا'[1] ہے، لہٰذا کتاب ہدایت بھی ہے اور پیغمبر بھی۔ اُس کے بعد اب کسی پیغمبر کے بھیجنے کی ضرورت باقی نہیں رہی:

وَاُوْحِیَ اِلَیَّ ھٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَکُمْ بِہٖ وَمَنْۢ بَلَغَ. (الانعام 19:6)

''اور میری طرف یہ قرآن اِس لیے وحی کیا گیا ہے کہ اِس کے ذریعے سے میں تمھیں خبردار کروں اور اُن کو بھی جنھیں یہ پہنچے۔''

ثانیاً، صرف قرآن ہی نہیں، بنی اسمٰعیل کو بھی اللہ تعالیٰ نے نبیوں کا قائم مقام ٹھیرا دیا۔ چنانچہ فرمایا کہ خدا کے آخری پیغمبر اور دنیا کی دوسری قوموں کے درمیان وہ ایک اُمت وسط[2] ہیں، لہٰذا اُن پر جو شہادت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے، وہی شہادت اب دنیا کے سب لوگوں پر وہ دیں گے اور خدا کی ہدایت بے کم و کاست اور پوری قطعیت کے ساتھ اُن تک پہنچاتے رہیں گے، یہاں تک

---

[1] ۔ الفرقان 1:25۔

[2] ۔ البقرہ 143:2۔

کہ قیامت کا دن آجائے اور لوگ خدا کے حضور میں جواب دہی کے لیے بلا لیے جائیں:

وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ، هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ، مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ، هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا، لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ.(الحج22:78)

”اللہ کی راہ میں جدوجہد کرو، جیسا کہ جدوجہد کا حق ہے۔ اُس نے تمھیں چن لیا ہے اور (جو) شریعت (تمھیں عطا فرمائی ہے، اُس) میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی ہے۔ تمھارے باپ ـــــ ابراہیم ـــــ کی ملت تمھارے لیے پسند فرمائی ہے۔ اُسی نے تمھارا نام مسلم رکھا تھا، اِس سے پہلے اور اِس قرآن میں بھی (تمھارا نام مسلم ہے)۔ اِس لیے چن لیا ہے کہ رسول تم پر (اِس دین کی) شہادت دے اور دنیا کے سب لوگوں پر تم (اِس کی) شہادت دینے والے بنو۔“

اسلام کی دعوت کے لیے یہ خدا کی اسکیم ہے۔ اِس کے بعد بھی جو لوگ ختم نبوت پر اظہار تعجب کرتے یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کو کسی خاص قوم یا علاقے یا دور تک محدود سمجھتے ہیں، اُن کے بارے میں اِس کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے:

چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

سید منظور الحسن

# شق القمر

## غامدی صاحب کا موقف

[محمد حسن الیاس کے ساتھ ایک مکالمے سے لیا گیا]

(18)

### شق قمر کا واقعہ: مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی کا موقف

گذشتہ ابواب میں استاذِ گرامی جناب جاوید احمد غامدی کا موقف پوری تفصیل سے سامنے آ گیا ہے۔ یہ اپنے بنیادی استدلال اور مرکزی خیال کے لحاظ سے سید ابوالاعلیٰ مودودی اور مولانا امین احسن اصلاحی کے نقطہ ہاے نظر پر مبنی ہے۔ اِس موضوع پر اپنی گفتگو میں اُنھوں نے اِس بات کو نہایت صراحت سے بیان کیا ہے۔ اُن کے الفاظ یہ ہیں:

”میں شق قمر کے معاملے میں متفرد نہیں ہوں، میری کوئی الگ راے نہیں ہے۔ اِس میں محقق علما کا ایک نقطۂ نظر ہے، میں اُسے صحیح سمجھتا ہوں۔ مجھ سے پہلے دو جلیل القدر اہل علم نے یہ نقطۂ نظر اپنی تفسیروں میں بیان کر دیا ہے۔ میرے جلیل القدر استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اِس کو اپنی تفسیر ”تدبرِ قرآن“ میں بیان کیا ہے اور اُن سے پہلے دورِ حاضر کے جلیل القدر داعی مولانا سید

ابوالاعلیٰ صاحب مودودی نے اِسے ''تفہیم القرآن'' میں بیان کیا ہے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اِس باب کی تمام چیزوں کو موضوع بنایا ہے اور نہایت خوبی کے ساتھ پورے مواد کا تجزیہ کر کے یہ بتایا ہے کہ واقعے کی نوعیت کیا ہے؟ روایات میں کیا بات بیان ہوئی ہے؟ اِس کو دیکھنا کیسے چاہیے؟ اِس پر کیا اعتراضات ہوتے ہیں؟ اِس میں جو مختلف تعبیریں اختیار کی گئی ہیں، اُن میں کتنا وزن ہے؟ اِن تمام چیزوں کا بہت عمدہ تجزیہ کر دیا ہے۔ میں اِن کے حرف حرف سے اِس معاملے میں اتفاق کرتا ہوں۔ اِس لیے یہ بات ہی درست نہیں ہے کہ میں اِس میں متفرد ہوں یا میری کوئی الگ رائے ہے۔'' (ویڈیو ریکارڈنگ 23 اعتراضات، شق القمر)

اِس تناظر میں یہ ضروری ہے کہ موضوع کے جملہ مباحث پر اِن جلیل القدر علما کی توضیحات کو بعینہٖ نقل کر دیا جائے۔ اِس سے وہ مندرجات سامنے آ جائیں گے، جن کی تفصیل گذشتہ صفحات میں کی گئی ہے۔

مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی نے اپنا موقف اپنی تفاسیر ''تفہیم القرآن'' اور ''تدبرِ قرآن'' میں سورۂ قمر کی ابتدائی آیات کے تحت بیان کیا ہے۔ اِس کے مباحث درجِ ذیل ہیں:

## 1۔ سورۂ قمر کا موضوع اور مخاطبین

دونوں مفسرین کے نزدیک سورہ کے مخاطبین کفارِ قریش ہیں۔ اُنھیں تنبیہ کی گئی ہے کہ قیامت کی گھڑی قریب آ پہنچی ہے۔ اِس کی نشانی کے طور پر چاند شق کر کے دکھا دیا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اگر وہ سمجھنا چاہیں تو اِس واضح نشانی کو دیکھ کر سمجھ سکتے ہیں۔ اِس کے بعد اب اُن کے پاس بہت تھوڑا وقت بچا ہے۔ سابقہ اقوام کے انجام کا ذکر کر کے متنبہ کیا ہے کہ اگر تمھاری یہ روش جاری رہی تو تمھارا انجام بھی اُنھی جیسا ہو گا۔

مولانا مودودی بیان کرتے ہیں:

''اِس میں کفارِ مکہ کو اِس ہٹ دھرمی پر متنبہ کیا گیا ہے، جو اُنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مقابلہ میں اختیار کر رکھی تھی۔ شق القمر کا حیرت انگیز واقعہ اِس بات کا صریح نشان تھا کہ وہ قیامت جس کے آنے کی خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دے رہے تھے، فی الواقع برپا ہو سکتی ہے، اور اُس کی آمد کا وقت قریب آ لگا ہے۔... کلام کا آغاز کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ

یہ لوگ نہ سمجھانے سے مانتے ہیں، نہ تاریخ سے عبرت حاصل کرتے ہیں، نہ آنکھوں سے صریح نشانیاں دیکھ کر ایمان لاتے ہیں۔ اب یہ اُسی وقت مانیں گے، جب قیامت فی الواقع برپا ہو جائے گی اور قبروں سے نکل کر یہ داورِ محشر کی طرف دوڑے جا رہے ہوں گے۔

اِس کے بعد اُن کے سامنے قوم نوح، عاد، ثمود، قوم لوط، اور آل فرعون کا حال مختصر الفاظ میں بیان کر کے بتایا گیا ہے کہ خدا کے بھیجے ہوئے رسولوں کی تنبیہات کو جھٹلا کر یہ قومیں کس دردناک عذاب سے دوچار ہوئیں، اور ایک ایک قوم کا قصہ بیان کرنے کے بعد بار بار یہ بات دہرائی گئی ہے کہ یہ قرآن نصیحت کا آسان ذریعہ ہے، جس سے اگر کوئی قوم سبق لے کر راہِ راست پر آ جائے تو اُن عذابوں کی نوبت نہیں آسکتی، جو اِن قوموں پر نازل ہوئے۔ اب آخر یہ کیا حماقت ہے کہ اِس آسان ذریعہ سے نصیحت قبول کرنے کے بجاے کوئی اِسی پر اصرار کرے کہ عذاب دیکھے بغیر نہ مانے گا۔'' (تفہیم القرآن 5/227-226)

مولانا اصلاحی لکھتے ہیں:

''مخاطب اِس میں وہ مکذبین ہیں، جو قرآن کے انذار کی تصدیق کے لیے کسی ایسی نشانی عذاب کا مطالبہ کر رہے تھے، جو اُنھیں قائل کر دے کہ فی الواقع قرآن کی یہ دھمکی سچی ہو کے رہے گی، اگر وہ اِس کو جھٹلاتے رہے۔ اُن کو پچھلی قوموں کی تاریخ، جس کی طرف پچھلی سورہ میں بھی اشارہ ہے، نسبتاً تفصیل کے ساتھ سنا کر متنبہ فرمایا ہے کہ آخر اِن قوموں کے انجام سے کیوں عبرت نہیں حاصل کرتے؟ کیوں مچلے ہوئے ہو کہ جب یہی کچھ تمھارے سروں پر بھی گزر جائے گا، تب مانو گے؟ یہ اللہ تعالیٰ کا عظیم احسان ہے کہ اُس نے تمھیں عذاب کی نشانی دکھانے کی جگہ ایک ایسی کتاب تم پر اتاری ہے، جو تمھاری تعلیم و تذکیر اور تمھارے شکوک و شبہات دور کرنے کے لیے ہر پہلو سے جامع و کامل اور تمام ضروری اوصاف و محاسن سے آراستہ ہے۔ لیکن تمھارا حال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کی جگہ تم اُس کے عذاب کے طالب بنے ہوئے ہو۔'' (تدبر قرآن 8/87)

## 2۔ 'انْشَقَّ' سے مراد ماضی یا مستقبل کا واقعہ

بعض مفسرین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ 'اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ' میں عہدِ رسالت

کے کسی واقعے کا بیان نہیں ہے، بلکہ قیامت کے موقع پر ہونے والے حادثے کی پیشین گوئی ہے۔ اِس تصور پر یہ اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ 'انشق' تو ماضی کا فعل ہے، اِس سے مستقبل کا واقعہ کیسے مراد لیا جا سکتا ہے؟ اِس کے جواب میں یہ استدلال کیا گیا ہے کہ مستقبل کے کسی واقعے کی قطعیت اور حتمیت کو نمایاں کرنے کے لیے ماضی کے صیغے کا استعمال عربی زبان و ادب کا مسلمہ قاعدہ ہے۔ مولانا اصلاحی اور مولانا مودودی، دونوں اِس قاعدے کو تسلیم کرتے ہیں، مگر مذکورہ مقام پر اُنھوں نے اِس کے اطلاق کو غلط قرار دیا ہے۔ چنانچہ اُن کے نزدیک یہ زمانۂ رسالت ہی کا واقعہ ہے۔

''تدبرِ قرآن'' میں ہے:

''بعض لوگوں نے یہ کہا ہے کہ یہ قیامت کے دن پیش آنے والے واقعہ کی خبر ہے۔ جس کو ماضی کے صیغہ سے اِس کی قطعیت کے اظہار کے لیے بیان فرمایا گیا ہے۔ اُن کے نزدیک مطلب یہ ہے کہ قیامت قریب آ گئی اور چاند پھٹ جائے گا۔ یہ قول اگرچہ اگلوں میں سے بھی بعض لوگوں سے نقل ہوا ہے اور اِس زمانے میں بھی اِس کو ایک گروہ کے اندر حسن قبول حاصل ہے، لیکن سیاقِ کلام اِس سے اِبا کرتا ہے۔ اِس میں تو شبہ نہیں ہے کہ قیامت میں پیش آنے والے واقعات قرآن میں ماضی کے اسلوب میں بیان ہوئے ہیں، لیکن یہاں یہ معنی لیے جائیں تو کلام آگے والی بات سے بے جوڑ ہو جاتا ہے۔ آگے فرمایا گیا ہے کہ یہ کوئی سی نشانی بھی دیکھیں گے تو اُس سے اعراض ہی کریں گے اور کہیں گے کہ اِس میں کوئی خاص ندرت نہیں، یہ تو جادو ہے، جو پہلے سے چلا آ رہا ہے۔ غور کیجیے کہ چاند کے پھٹنے کا تعلق قیامت سے ہوتا تو اُس کے بعد یہ بات کہنے کا کیا محل تھا؟ قیامت کے دن تو کٹر سے کٹر منکر بھی کسی چیز کو جادو نہ کہہ سکے گا، بلکہ سب اعتراف کریں گے کہ رسولوں نے جو خبر دی، وہ حرف حرف سچی نکلی۔ چنانچہ آگے بیان بھی ہوا ہے کہ 'یَقُوْلُ الْکٰفِرُوْنَ ھٰذَا یَوْمٌ عَسِرٌ' (اُس دن کافر کہیں گے کہ یہ تو بڑا ہی کٹھن دن آ گیا)۔'' (8/92-91)

''تفہیم القرآن'' میں بیان ہوا ہے:

''بعض لوگوں نے اِس فقرے کا مطلب یہ لیا ہے کہ ''چاند پھٹ جائے گا۔'' لیکن عربی زبان کے لحاظ سے چاہے یہ مطلب لینا ممکن ہو، عبارت کا سیاق و سباق اِس معنی کو قبول کرنے سے صاف انکار کرتا ہے۔ اول تو یہ مطلب لینے سے پہلا فقرہ ہی بے معنی ہو جاتا ہے۔ چاند اگر اِس

کلام کے نزول کے وقت پھٹا نہیں تھا، بلکہ وہ آیندہ کبھی پھٹنے والا ہے تو اِس کی بنا پر یہ کہنا بالکل مہمل بات ہے کہ قیامت کی گھڑی قریب آ گئی ہے۔ آخر مستقبل میں پیش آنے والا کوئی واقعہ اُس کے قرب کی علامت کیسے قرار پا سکتا ہے کہ اُسے شہادت کے طور پر پیش کرنا ایک معقول طرزِ استدلال ہو۔ دوسرے، یہ مطلب لینے کے بعد جب ہم آگے کی عبارت پڑھتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ وہ اِس کے ساتھ کوئی مناسبت نہیں رکھتی۔ آگے کی عبارت صاف بتا رہی ہے کہ لوگوں نے اُس وقت کوئی نشانی دیکھی تھی، جو امکانِ قیامت کی صریح علامت تھی، مگر اُنھوں نے اُسے جادو کا کرشمہ قرار دے کر جھٹلا دیا اور اپنے اِس خیال پر جمے رہے کہ قیامت کا آنا ممکن نہیں ہے۔ اِس سیاق و سباق میں اِنْشَقَّ الْقَمَرُ کے الفاظ اُسی صورت میں ٹھیک بیٹھ سکتے ہیں، جب کہ اُن کا مطلب ”چاند پھٹ گیا“ ہو۔ ”پھٹ جائے گا“ کے معنی میں اُن کو لے لیا جائے تو بعد کی ساری بات بے جوڑ ہو جاتی ہے۔ سلسلۂ کلام میں اِس فقرے کو رکھ کر دیکھ لیجیے، آپ کو خود محسوس ہو جائے گا کہ اِس کی وجہ سے ساری عبارت بے معنی ہو گئی ہے:

”قیامت کی گھڑی قریب آ گئی اور چاند پھٹ جائے گا۔ اُن لوگوں کا حال یہ ہے کہ خواہ کوئی نشانی دیکھ لیں، منہ موڑ جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ تو چلتا ہوا جادو ہے۔ اُنھوں نے جھٹلا دیا اور اپنی خواہشاتِ نفس کی پیروی کی۔“ (5/229-228)

## 3۔ واقعے سے متعلق آیات اور روایات کا باہمی تعلق

شق قمر کا واقعہ قرآنِ مجید اور احادیث و آثار، دونوں میں مذکور ہے۔ صاحبِ تدبر اور صاحبِ تفہیم یکساں طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ احادیث و آثار کو قرآنِ مجید کے متابعات کے طور پر قبول کرنا چاہیے۔ چنانچہ دونوں نے روایات کا ذکر اِس طرح کیا ہے کہ گویا قرآن کے متن کو اصل کی حیثیت حاصل ہے اور روایات میں اُسی کی بعض تفصیلات نقل ہوئی ہیں۔ مزید برآں لفظاً بھی اِس امر کی تصریح کر دی ہے۔

سید مودودی لکھتے ہیں:

”حقیقت یہ ہے کہ شق القمر کا واقعہ قرآن کے صریح الفاظ سے ثابت ہے اور حدیث کی روایات پر اُس کا انحصار نہیں ہے۔ البتہ، روایات سے اِس کی تفصیلات معلوم ہوتی ہیں اور پتا چلتا

ہے کہ یہ کب اور کیسے پیش آیا تھا۔" (تفہیم القرآن 5/229)

مولانا اصلاحی نے بیان کیا ہے:

"رہا یہ سوال کہ اِس طرح کا کوئی واقعہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں پیش آیا بھی ہے تو اِس کا جواب میرے نزدیک یہ ہے کہ قرآن کے الفاظ سے، یہی بات نکلتی ہے کہ یہ پیش آیا اور حدیثوں سے بھی اِس کی تائید ہوتی ہے۔ صورتِ واقعہ کے بارے میں تو حدیثیں ضرور مختلف ہیں، لیکن نفس واقعہ کے بارے میں کوئی اختلاف منقول نہیں ہے۔" (تدبر قرآن 8/92-91)

## 4۔ معجزۂ رسالت یا آیت الٰہی

تمہیدی باب میں "لفظِ 'آیۃ' کا مفہوم و مصداق" کے زیرِ عنوان یہ بات پوری طرح واضح ہو گئی تھی کہ قرآنِ مجید میں یہ لفظ اللہ کی نشانیوں کے لیے آیا ہے۔ یہ جہاں اللہ کی طرف سے براہِ راست ظاہر ہونے والی نشانیوں کے مفہوم میں ہے، وہاں انبیاے کرام کے معجزات کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔ دونوں میں اِس لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہے کہ دونوں اللہ کی قدرت کا کرشمہ ہیں اور اُسی کے حکم سے صادر ہوتی ہیں، مگر اظہار کے لحاظ سے یہ فرق ضرور ہے کہ اول الذکر میں اللہ تعالیٰ نبی کی وساطت کے بغیر براہِ راست معاملہ کرتے ہیں، جب کہ ثانی الذکر میں نبی کا توسط اختیار کیا جاتا ہے۔ ہماری مذہبی اصطلاح میں 'معجزے' کا لفظ اُس نشانی کے لیے اختیار کیا گیا ہے، جو مخاطبین کے مطالبے پر نبی کے ہاتھ سے ظاہر ہوتی ہے۔ اِس تناظر میں دیکھیے تو شق قمر کے لیے 'معجزہ' یا 'معجزۂ نبوت' کا لفظ استعمال کرنا مناسب نہیں ہے۔ اِسے 'آیتِ الٰہی' سے تعبیر کرنا چاہیے۔ مولانا اصلاحی اور مولانا مودودی، دونوں اِسی موقف کے قائل ہیں۔

مولانا مودودی نے اپنے موقف کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اِس ضمن میں اُنھوں نے اُن روایتوں پر بھی جرح کی ہے، جنھیں معجزے کے مفہوم پر محمول کرنے کے لیے بہ طورِ دلیل پیش کیا جاتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اِس واقعہ کی حقیقی نوعیت کیا تھی؟ کیا یہ ایک معجزہ تھا، جو کفارِ مکہ کے مطالبہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی رسالت کے ثبوت میں دکھایا تھا؟ یا یہ ایک حادثہ تھا، جو اللہ تعالیٰ کی قدرت سے چاند میں پیش آیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے لوگوں کو اُس کی طرف توجہ صرف اِس غرض کے لیے دلائی کہ یہ امکانِ قیامت اور قربِ قیامت کی ایک نشانی ہے؟ علماے اسلام کا ایک بڑا گروہ اِسے حضور کے معجزات میں شمار کرتا ہے اور اُن کا خیال یہ ہے کہ کفار کے مطالبہ پر یہ معجزہ دکھایا گیا تھا۔ لیکن اِس راے کا مدار صرف بعض اُن روایات پر ہے، جو حضرت انس سے مروی ہیں۔ اِن کے سوا کسی صحابی نے بھی یہ بات بیان نہیں کی ہے۔ ''فتح الباری'' میں ابنِ حجر کہتے ہیں کہ ''یہ قصہ جتنے طریقوں سے منقول ہوا ہے، اُن میں سے کسی میں بھی حضرت انس کی حدیث کے سوا یہ مضمون میری نگاہ سے نہیں گزرا کہ شق القمر کا واقعہ مشرکین کے مطالبہ پر ہوا تھا۔'' (باب انشقاق القمر)۔ ایک روایت ابو نعیم اصفہانی نے ''دلائل النبوۃ'' میں حضرت عبداللہ بن عباس سے بھی اِس مضمون کی نقل کی ہے، مگر اُس کی سند ضعیف ہے، اور قوی سندوں سے جتنی روایات کتب حدیث میں ابنِ عباس سے منقول ہوئی ہیں، اُن میں سے کسی میں بھی اِس کا ذکر نہیں ہے۔ علاوہ بریں حضرت انس اور حضرت عبداللہ بن عباس، دونوں اِس واقعہ کے ہم عصر نہیں ہیں۔ بہ خلاف اِس کے جو صحابہ اِس زمانے میں موجود تھے، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت حذیفہ، حضرت جبیر بن مطعم، حضرت علی، حضرت عبداللہ بن عمر، اُن میں سے کسی نے بھی یہ نہیں کہا ہے کہ مشرکین مکہ نے حضور کی صداقت کے ثبوت میں کسی نشانی کا مطالبہ کیا تھا اور اُس پر شق القمر کا یہ معجزہ اُن کو دکھایا گیا۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ قرآنِ مجید خود بھی اِس واقعہ کو رسالت محمدی کی نہیں، بلکہ قربِ قیامت کی نشانی کے طور پر پیش کر رہا ہے۔'' (تفہیم القرآن 5/230-229)

مولانا اصلاحی کا بیان یہ ہے:

''اِس طرح کی نشانیوں کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ رسول نے اِن کو اپنے معجزے کے طور پر پیش کیا ہو، بلکہ اِن کا ظہور کسی اعلان و تحدی کے بغیر بھی ہو سکتا ہے۔ یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ کفار نے بعینہٖ اِسی نشانی کا مطالبہ کیا ہو، جو ظاہر ہوئی، بلکہ اُن کی طرف سے کسی مطالبہ کے بغیر محض اِس لیے بھی اِن کا ظہور ہوتا ہے کہ کفار کے پیش کردہ شبہات کا اُن کو جواب مل جائے۔ کفار قیامت کو جو بہت بعید از عقل چیز خیال کرتے تھے، اُس کا ایک بہت بڑا سبب یہ بھی تھا کہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ یہ ساری کائنات ایک دن بالکل درہم برہم ہو جائے۔ پہاڑوں سے متعلق اُن کا جو سوال قرآن میں نقل ہوا ہے، اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن چیزوں

کو وہ بالکل اٹل، غیر متزلزل اور غیر فانی سمجھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے شق قمر کی نشانی دکھا کر اُن کو بتایا کہ اِس کائنات کی چیزوں میں سے کوئی چیز بھی، خواہ وہ کتنی ہی عظیم ہو، نہ خود مختار ہے، نہ غیر فانی، نہ غیر متزلزل، بلکہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کے حکم کے تابع ہے۔ وہ جب چاہے گا، اِن سب کو درہم برہم کر کے رکھ دے گا۔‘‘(تدبر قرآن 8/91)

## 5۔ رسالت محمدی کی تائید و تصدیق

دونوں مفسرین شق قمر کو معجزات النبی کے زمرے میں شمار نہ کرنے کے باوجود اِس امر کو تسلیم کرتے ہیں کہ یہ واقعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کی صداقت کی تاکید اور آپ کے انذار اور دعوت کی تائید کرتا ہے۔

مولانا اصلاحی نے لکھا ہے:

’’اللہ تعالیٰ کی ایک سنت کا حوالہ ہم اِس کتاب میں جگہ جگہ دے چکے ہیں کہ یوں تو اِس زمین و آسمان کے چپہ چپہ پر اُس کی قدرت و حکمت کی نشانیاں موجود ہیں اور آئے دن نئی نئی نشانیاں بھی ظاہر ہوتی رہتی ہیں، لیکن رسولوں کی بعثت کے زمانے میں اللہ تعالیٰ خاص طور پر ایسی نشانیاں ظاہر فرماتا ہے، جس سے رسول کے انذار اور اُس کے دعواے رسالت کی صداقت ظاہر ہوتی ہے۔ قرآن میں اِس سنتِ الٰہی کا ذکر جگہ جگہ ہوا ہے۔ ہم ایک آیت بہ طور مثال پیش کرتے ہیں۔ فرمایا ہے:

’سَنُرِيۡهِمۡ آيَاتِنَا فِي الۡاٰفَاقِ وَفِيۡۤ أَنۡفُسِهِمۡ‘(حٰم السجدہ 53)، (ہم عنقریب اُن کو دکھائیں گے اپنی نشانیاں اِس کائنات میں بھی اور خود اُن کے اندر بھی)۔

اِن نشانیوں کا مقصود، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، رسول کے انذار کو تقویت پہنچانا ہوتا ہے۔ رسول جن باتوں کی منادی زبان سے کرتا ہے، اُس کی تائید کے آثار و شواہد اِس کائنات میں بھی، مختلف شکلوں میں، ظاہر ہوتے ہیں تاکہ لوگوں پر اللہ تعالیٰ کی حجت اچھی طرح پوری ہو جائے۔ اِسی طرح کی ایک نشانی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انذار کی تائید کے لیے چاند کے پھٹنے کی صورت میں ظاہر ہوئی تاکہ منکرین عذاب و قیامت پر یہ بات اچھی طرح واضح ہو جائے کہ قرآن اُن کو جو ڈرا رہا ہے کہ زمین اُس دن ہلا دی جائے گی، پہاڑ پاش پاش ہو کر فضا میں اڑنے

لگیں گے، سمندر ابل پڑیں گے، سورج تاریک ہو جائے گا؛ یہ باتیں اُن کو مرعوب کرنے کے لیے نہیں بیان ہوئی ہیں، بلکہ یہ حقائق ہیں، جو ایک دن پیش آ کے رہیں گے اور یہ بعید از امکان بھی نہیں ہیں، اِن کے شواہد کسی نہ کسی شکل میں اِس دنیا میں بھی سامنے آتے رہتے ہیں۔''

(تدبر قرآن 8/ 91-90)

مولانا مودودی بیان کرتے ہیں:

''یہ اِس لحاظ سے حضور کی صداقت کا ایک نمایاں ثبوت ضرور تھا کہ آپ نے قیامت کے آنے کی جو خبریں لوگوں کو دی تھیں، یہ واقعہ اُن کی تصدیق کر رہا تھا۔'' (تفہیم القرآن 5/ 230)

[باقی]

تفہیم الآثار

ڈاکٹر عمار خان ناصر

# صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا علم و عمل بہ طور اسوہ

[اکابر تابعین واتباع تابعین کے آثار]

(4)

## (9)

حَدَّثَنَا أَبُو إِسْحَاقَ، قَالَ: سَأَلْتُ الْاَوْزَاعِيَّ فَقَالَ: اصْبِرْ نَفْسَكَ عَلَى السُّنَّةِ، وَقِفْ حَيْثُ وَقَفَ الْقَوْمُ، وَقُلْ بِمَا قَالُوا، وَكُفَّ عَمَّا كَفُّوا عَنْهُ، وَاسْلُكْ سَبِيلَ سَلَفِكَ الصَّالِحِ، فَإِنَّهُ يَسَعُكَ مَا وَسِعَهُمْ . . . وَلَوْ كَانَ هَذَا خَيْرًا مَا خُصِصْتُمْ بِهِ دُونَ أَسْلَافِكُمْ، فَإِنَّهُ لَمْ يُدَّخَرْ عَنْهُمْ خَيْرٌ خُبِّئَ لَكُمْ دُونَهُمْ لِفَضْلٍ عِنْدَكُمْ، وَهُمْ أَصْحَابُ نَبِيِّهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الَّذِينَ اخْتَارَهُمْ وَبَعْثَهُ فِيهِمْ، وَوَصَفَهُمْ بِمَا وَصَفَهُمْ بِهِ، فَقَالَ: مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللّٰهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ تَرَاهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا. (اللالکائی، شرح اصول اعتقاد اہل السنہ، رقم 279)

”ابو اسحاق کا بیان ہے کہ میں نے اوزاعی سے پوچھا تو انھوں نے فرمایا: اپنے آپ کو سنت پر

ثابت قدم رکھو، اور جہاں صحابہ رک گئے، تم بھی وہیں رک جاؤ اور جو انھوں نے کہا، وہی کہو، اور جس چیز سے انھوں نے گریز کیا، اس سے گریز کرو اور اپنے نیک اسلاف کے راستے پر چلو، کیونکہ جو ان کے لیے کافی تھا، وہ تمھیں بھی کافی ہے... اور (جو سوال تم نے پوچھا ہے) اگر یہ کوئی خیر کی بات ہوتی تو تمھارے اسلاف کو چھوڑ کر خاص طور پر تمھیں نہ سجھائی جاتی۔ ان سے خیر کی کوئی بات چھپا کر نہیں رکھی گئی جو انھیں نہ بتائی گئی ہو اور تمھاری فضیلت کی وجہ سے تمھیں بتادی گئی ہو۔ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ تھے جنھیں اللہ نے منتخب کیا اور ان میں اپنے نبی کو بھیجا اور ان کے اوصاف بیان کرتے ہوئے فرمایا: ''محمد اللہ کے رسول ہیں، اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں، کافروں پر سخت اور آپس میں رحم دل ہیں۔ تم انھیں دیکھو گے کہ وہ اللہ کے فضل اور اس کی رضا کی تلاش میں رکوع اور سجدے کی حالت میں رہتے ہیں۔''

## لغوی تشریح

خُبِّئَ لَكُمْ: 'خَبْء' سے مشتق ہے، جس کا مطلب چھپی ہوئی چیز ہوتا ہے۔ 'خُبِّئَ لَكُمْ'، یعنی تمھارے لیے چھپا کر رکھی گئی ہے۔

## صاحب اثر کا تعارف

ابو عمرو عبد الرحمٰن بن عمرو الاوزاعی، اتباع تابعین میں بلند مرتبہ عالم شمار ہوتے ہیں۔ 88ھ میں دمشق کے ایک محلے اوزاع میں ولادت ہوئی اور اس نسبت سے اوزاعی کہلائے۔ عطاء بن ابی رباح، محمد الباقر، مکحول، قتادہ اور زہری جیسے اکابر تابعین سے روایت حدیث کی۔ فقیہ اہل الشام کے لقب سے جانے جاتے تھے اور ایک مستقل فقہی مذہب کے بانی تھے، جو ابتدائی صدیوں میں اہل شام اور اہل اندلس کے ہاں معمول بہ رہا، پھر مرور زمانہ سے اپنی حیثیت باقی نہ رکھ سکا۔ 175ھ میں وفات پائی۔[1]

---

[1] ۔ سیر اعلام النبلاء 7/120-108۔

## شرح ووضاحت

یہ اثر ایک مفصل روایت کا ٹکڑا ہے۔ امام اوزاعی سے یہ سوال پوچھا گیا تھا کہ اگر کسی شخص سے یہ سوال کیا جائے کہ کیا تم سچ مچ مومن ہو تو اسے جواب میں کیا کہنا چاہیے؟ اوزاعی نے اس کے جواب میں کہا کہ:

إِنَّ الْمَسْأَلَةَ عَمَّا سُئِلَ مِنْ ذَلِكَ بِدْعَةٌ، وَالشَّهَادَةُ عَلَيْهِ تَعَنُّتٌ، ولَمْ نُكَلَّفْهُ فِي دِينِنَا، ولَمْ يَشْرَعْهُ نَبِيُّنَا عَلَيْهِ أَفْضَلُ الصَّلاةِ وَأَزْكَى السَّلامُ. (حلیۃ الاولیاء، رقم 12495)

”اس کے بارے میں سوال کرنا بدعت ہے، اور اس کے متعلق گواہی دینا (یا قسم کھانا) خواہ مخواہ تکلف میں پڑنا ہے۔ ہم سے ہمارے دین میں اس کا تقاضا نہیں کیا گیا اور نہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو مشروع قرار دیا ہے۔“

سوال کا پس منظر یہ تھا کہ چونکہ کسی انسان کو اپنے انجام کے متعلق یہ معلوم نہیں کہ اس کا خاتمہ ایمان پر ہو گا یا نہیں، اس لیے انجام سے بے خبر ہوتے ہوئے کیا کسی کے لیے حال میں 'أنا مومن' (میں صاحب ایمان ہوں) کہہ کر اپنے ایمان کی گواہی دینا درست ہے یا نہیں؟ بعض کلامی گروہوں کا یہ کہنا تھا کہ 'ان شاء اللہ' (یعنی اگر اللہ نے چاہا) کی قید شامل کیے بغیر کسی کو اپنے ایمان کی گواہی نہیں دینی چاہیے۔ اس کے برخلاف، بعض گروہ 'إن شاء اللہ' کہنے کو بہ حالت موجودہ اپنے ایمان میں شک پر محمول کرتے ہوئے اسے ناجائز قرار دیتے تھے۔

امام اوزاعی نے زیر بحث اثر میں جماعت صحابہ کی دینی حیثیت کا حوالہ دے کر واضح کیا ہے کہ اس طرح کے غیر ضروری سوالات اٹھانا اور ان کے جواب متعین کرنا ہی درست نہیں، کیونکہ دین میں نجات کے لیے جن سوالوں کا جواب انسان کو معلوم ہونا ضروری ہے، وہ اللہ اور اس کے رسول نے صحابۂ کرام کو بتا دی ہیں۔ اگر کوئی چیز ان کو نہیں بتائی گئی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ دین میں اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ اگر ان کے بعد لوگ ایسے سوالات اختراع کر رہے ہیں جن کا صحابہ کے ہاں کوئی ذکر نہیں ملتا اور ان کا جواب معلوم ہونے کو ضروری قرار دے رہے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ صحابہ سے افضل ہونے کے مدعی ہیں جن پر دین کی کوئی ایسی حقیقت واضح ہو

گئی ہے جو صحابہ پر مخفی رہ گئی تھی۔

## تخریج اور اختلاف طرق

ابو اسحاق الفزاری کے واسطے سے الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ یہ اثر درج ذیل مآخذ میں بھی نقل ہوا ہے:

الآجری، الشریعۃ، رقم 305۔ ابو نعیم، حلیۃ الاولیاء، رقم 12495۔ الہروی، ذم الکلام واہلہ 118۔

## (10)

عن الهقل بن زياد، عن الاوزاعی قال: وَمَا رَأْی امرىء فِي أَمْرٍ بَلَغَهُ عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم إِلَّا اتِّبَاعُهُ، وَلَوْلَمْ يَكُنْ فِيهِ عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم وَقَالَ فِيهِ أَصْحَابُهُ مِنْ بَعْدِهِ كَانُوا أَوْلَى فِيهِ بِالْحَقِّ مِنَّا، لِاَنَّ اللّٰهَ تَعَالَى أَثْنَى عَلَى مَنْ بَعْدَهُمْ بِاتِّبَاعِهِمْ إِيَّاهُمْ، فَقَالَ: ’وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُمْ بِإِحْسَانٍ‘ وَقُلْتُمْ أَنْتُمْ: لَا بَلْ نَعْرِضُهَا عَلَى رَأْيِنَا فِي الْكِتَابِ، فَمَا وَافَقَهُ مِنْهَا صَدَّقْنَاهُ وَمَا خَالَفَهُ تَرَكْنَاهُ، وَتِلْكَ غَايَةُ كُلِّ مُحْدِثٍ فِي الْإِسْلَامِ: رَدُّ مَا خَالَفَ رَأْيَهُ مِنَ السُّنَّةِ. (الہروی، ذم الکلام واہلہ 3/11)

”ہقل بن زیاد کی روایت ہے کہ اوزاعی نے کہا: جس معاملے میں کسی شخص کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے کوئی بات پہنچے، اس کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں کہ وہ اس کی پیروی کرے۔ اگر کسی مسئلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی بات منقول نہ ہو اور آپ کے بعد آپ کے صحابہ نے اس پر کوئی رائے دی ہو تو وہ ہم سے بڑھ کر صحیح بات کہنے کے حق دار ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے بعد آنے والوں کی، ان کی پیروی کرنے پر تعریف فرمائی ہے اور کہا ہے: ”اور وہ جو ان کی پیروی کرتے ہیں اچھے طریقے سے۔“ (اس کے برخلاف)، تم لوگ کہتے ہو: نہیں، بلکہ ہم ان کی رائے کو کتاب اللہ کے متعلق اپنی رائے پر پیش کریں گے۔ جو اس کے مطابق ہو گا، اسے مانیں گے اور جو اس کے خلاف ہو گا، اسے چھوڑ دیں گے۔ اور اسلام میں ہر نئی بات نکالنے والے کا مقصود یہی ہے کہ اس کی رائے کے خلاف جو بات سنت سے ثابت ہو، اسے رد کر دے۔“

## شرح ووضاحت

1۔ قرآن مجید میں 'وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَان' کی تعبیر اپنے سیاق وسباق کے لحاظ سے صحابہ کی جماعت میں شامل ان افراد کے لیے آئی ہے، جنھوں نے مہاجرین اور انصار کے بعد اسلام قبول کیا اور ان کے نقش قدم پر چلے۔[2] تاہم، مختلف آثار میں 'تابعین بالاحسان' کی تعبیر کا اطلاق صحابہ کے بعد آنے والے اہل ایمان پر بھی کیا گیا ہے، جو اس کا توسیعی مفہوم ہے۔ اوزاعی کا یہ اثر اسی کی ایک مثال ہے۔

2۔ اس اثر میں اوزاعی نے ایک لطیف استنباط کرتے ہوئے صحابہ کے علم وعمل کی دینی اہمیت کو اور ان کے اسوہ پر اپنی راے کو مقدم رکھنے کی قباحت کو واضح کیا ہے۔ قرآن مجید نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے سابقون اولون، یعنی مہاجرین وانصار کے بعد ان صحابہ کا ذکر کیا ہے جنھوں نے ان کے بعد اچھے انداز میں ان کی پیروی اختیار کی اور اہل ایمان کی جماعت میں شامل ہوئے۔ اوزاعی یہاں 'اتباع' کی تعبیر سے یہ استنباط کرتے ہیں کہ بعد میں آنے والوں سے مطلوب رویہ یہ ہے کہ وہ صحابہ کی پیروی کریں، نہ کہ ان سے الگ راستہ اختیار کریں۔ اوزاعی نے صحابہ کے اسوہ کو 'السُّنَّة' سے تعبیر کیا ہے، کیونکہ صحابہ کی جماعت دینی علم وعمل میں جس نمونے پر قائم تھی، اس پر انھیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کاربند کیا تھا۔ اس کو نظر انداز کر کے مشتبہ دینی استدلالات کی مدد سے نئی نئی آرا قائم کرنا اور صحابہ کی رہنمائی کو قبول کرنے کے بجاے ان کے علم وعمل کو اپنی آرا پر پرکھنا اوزاعی کی نظر میں وہ بنیادی رویہ ہے جس سے تمام اعتقادی وعملی بدعات پیدا ہوتی ہیں۔

## تخریج اور اختلاف طرق

یہ اثر نقض الدارمی علی المریسی[3] میں بھی منقول ہے۔

---

[2]۔ التوبہ 100:9۔

[3]۔ 253۔

(11)

نا بَقِيَّةُ بْنُ الْوَلِيدِ قَالَ: قَالَ لِي الْأَوْزَاعِيُّ: يَا بَقِيَّةُ، الْعِلْمُ مَا جَاءَ عَنْ أَصْحَابِ مُحَمَّدٍ صلى الله عليه وسلم وَمَا لَمْ يَجِئْ عَنْ أَصْحَابِ مُحَمَّدٍ صلى الله عليه وسلم فَلَيْسَ بِعِلْمٍ. (ابن عبد البر، الجامع فی بیان العلم وفضلہ، رقم 894، 895)

"بقیہ بن ولید کہتے ہیں کہ اوزاعی نے مجھ سے کہا: اے بقیہ، (دین کا) علم وہی ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی طرف سے آئے۔ جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی طرف سے نہ ہو، وہ علم نہیں ہے۔"

## شرح ووضاحت

اس اثر کا مدعا بھی وہی ہے جو گذشتہ اثر میں واضح کیا گیا۔ مراد یہ ہے کہ دین میں کن چیزوں کا علم اہمیت رکھتا ہے اور کن کا نہیں، اس کا معیار یہ ہے کہ صحابۂ کرام کی نظر میں اس چیز کی کتنی اہمیت ہے۔ اگر کسی چیز کو صحابہ نے اہمیت دی ہے تو وہ دین کے مطلوب علم کا حصہ ہے اور اگر نہیں دی تو وہ علم، یعنی دین کا حصہ نہیں ہے۔

## تخریج اور اختلاف طرق

اوزاعی کا یہ اثر ابن عساکر نے "تاریخ دمشق"[4] میں سند کے ساتھ، جب کہ ذہبی نے "تاریخ الاسلام"[5] میں اور ابن کثیر نے "البدایۃ والنہایۃ"[6] میں سند کے بغیر نقل کیا ہے۔

(12)

حَدَّثَنِي الْوَلِيدُ بْنُ مَسْلِمٍ، عَنِ الْأَوْزَاعِيِّ، قَالَ: أَدْرَكْتُ خِلَافَةَ مُعَاوِيَةَ عِدَّةٌ مِنْ

---

[4] ۔35/201۔

[5] ۔4/124۔

[6] ۔10/117۔

أَصْحَابِ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وسَلَّمَ مِنْهُمْ: سَعْدٌ، وَأُسَامَةُ، وَجَابِرٌ، وَابْنُ عُمَرَ، وَزَيْدُ بْنُ ثَابِتَ، وَمَسْلَمَةُ بْنُ مَخْلَدٍ، وَأَبُو سَعِيدٍ، وَرَافِعُ بْنُ خُدَيْجٍ، وَأَبُو أُمَامَةَ، وَأَنَسُ بْنُ مَالِكٍ، وَرِجَالٌ أَكْثَرُ مِمَّنْ سَمَّيْتُ بِأَضْعَافٍ مُضَاعَفَةٍ، كَانُوا مَصَابِيحَ الْهُدَى وَأَوْعِيَةَ الْعِلْمِ، حَضَرُوا مِنَ الْكِتَابِ تَنْزِيلَهُ، وَأَخَذُوا عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وسَلَّمَ تَأْوِيلَهُ، وَمِنَ التَّابِعِينَ لَهُمْ بِإِحْسَانٍ إِنْ شَاءَ اللّٰهُ مِنْهُمْ: الْمِسْوَرُ بْنُ مَخْرَمَةَ، وَعَبْدُ الرَّحْمَنِ بْنُ الْاَسْوَدِ بْنِ عَبْدِ يَغُوثَ، وَسَعِيدُ بْنُ الْمُسَيِّبِ، وَعُرْوَةُ بْنُ الزُّبَيْرِ، وَعَبْدُ اللّٰهِ بْنُ مُحَيْرِيزٍ فِي أَشْبَاهٍ لَهُمْ، لَمْ يَنْزَعُوا يَدًا عَنْ مُجَامَعَةٍ فِي أُمَّةِ مُحَمَّدٍ صلى اللّٰه عليه وسلم. (تاریخ ابی زرعہ الدمشقی، رقم 102، 571)

”ولید بن مسلم، اوزاعی سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے کہا: سیدنا معاویہ کی خلافت کا دور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی ایک بڑی تعداد نے پایا۔ ان میں سعد (بن ابی وقاص)، اسامہ (بن زید)، جابر، ابن عمر، زید بن ثابت، مسلمہ بن مخلد، ابو سعید، رافع بن خدیج، ابو امامہ، انس بن مالک اور جن کے نام میں نے ذکر کیے ہیں، ان کے علاوہ تعداد میں ان سے کئی گنا زیادہ صحابہ شامل ہیں۔ یہ لوگ ہدایت کے چراغ اور علم کے حامل و محافظ تھے۔ انھوں نے کتاب اللہ کو اپنے سامنے اترتے ہوئے دیکھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی مراد سمجھی۔ (صحابہ کے بعد) ان کے تابعین بالاحسان میں سے مسور بن مخرمہ، عبد الرحمٰن بن اسود بن عبد یغوث، سعید بن المسیب، عروہ بن زبیر اور عبد اللہ بن محیریز نے اور ان جیسے دیگر حضرات نے بھی (سیدنا معاویہ کا دور خلافت پایا)۔ ان سب نے امت محمدی میں اتفاق و اتحاد کے معاملے سے اپنا ہاتھ نہیں کھینچا۔“

## شرح و وضاحت

1۔ امام اوزاعی کا مقصود ان گروہوں کے تقابل میں جو سیدنا معاویہ کی خلافت سے متعلق منفی نقطۂ نظر رکھتے تھے، اکابر صحابہ و تابعین کے موقف کی صحت کو واضح کرنا ہے۔ سیدنا معاویہ نے قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ سے قصاص لینے کے معاملے میں سیدنا علی سے اختلاف کیا اور ان کی بیعت کرنے سے توقف ظاہر کیا تھا۔ اس پر صحابہ، سیدنا علی اور سیدنا معاویہ کی قیادت میں دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے، جس کے نتیجے میں جنگ صفین رونما ہوئی اور مسلمانوں کی دو متوازی

حکومتیں قائم ہو گئیں۔ سیدنا علی کی شہادت کے بعد کوفہ میں ان کے بڑے فرزند سیدنا حسن کو خلیفہ منتخب کیا گیا۔ اس موقع پر بھی دونوں گروہوں کے مابین دوبارہ جنگ چھڑنے کے امکانات دکھائی دینے لگے تو سیدنا معاویہ کی طرف سے مصالحت کی پیش کش پر سیدنا حسن نے ان کے حق میں خلافت سے دست برداری قبول کر لی۔[7] نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ایک پیشین گوئی میں سیدنا حسن کے اس مصالحانہ کردار کا ذکر فرمایا تھا۔ آپ نے فرمایا:

إِنَّ ابْنِي هَذَا سَيِّدٌ، وَلَعَلَّ اللهَ أَنْ يُصْلِحَ بِهِ بَيْنَ فِئَتَيْنِ عَظِيمَتَيْنِ مِنَ الْمُسْلِمِينَ. (بخاری، رقم 279)

”میرا یہ بیٹا سردار ہے اور توقع ہے کہ اللہ اس کے ذریعے سے مسلمانوں کی دو بڑی جماعتوں کے درمیان مصالحت کرا دے گا۔“

تقریباً چھ سال کی باہمی خوں ریزی کے بعد دوبارہ وحدت اور اجتماعیت کا قائم ہو جانا اہل اسلام کے لیے عموماً خوشی اور اطمینان کا موجب بنا اور اس سال کو ’عام الجماعۃ‘ قرار دیا گیا اور اس وقت موجود تمام اکابر صحابہ نے سیدنا معاویہ کی بیعت کر لی۔ اوزاعی نے اس ضمن میں دس کے قریب صحابہ اور تابعین میں سے مسور بن مخرمہ، عبد اللہ بن محیریز، عروہ بن زبیر، عبد الرحمٰن بن الاسود اور سعید بن المسیب کے نام ذکر کیے ہیں۔ ان کے علاوہ سیدہ عائشہ، ابو ہریرہ، عبد اللہ بن عباس، ابو الدرداء اور ابو سعید خدری رضی اللہ عنہم بھی بیعت کرنے والوں میں شامل تھے۔ یہاں تک کہ سعد بن ابی وقاص، عبد اللہ بن عمر اور محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہم جیسے صحابہ نے بھی، جنھوں نے اس کشمکش میں کسی فریق کا بھی ساتھ نہیں دیا تھا اور بالکل کنارہ کشی اختیار کر لی تھی، مسلمانوں کی اجتماعیت بحال ہونے پر سیدنا معاویہ کی بیعت کر لی۔[8] تاہم خوارج اور شیعان علی، جنھوں نے ابتداءً سیدنا علی کے مقابلے میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی مخالفت کی تھی، سیدنا حسن اور سیدنا معاویہ کی مصالحت کے بعد بھی ان کی خلافت کو جائز ماننے پر آمادہ نہیں ہوئے۔ اوزاعی نے زیر بحث اثر میں اسی نقطۂ نظر کے حضرات کے سامنے یہ بات واضح کی ہے کہ اکابر صحابہ و تابعین نے جو ان

---

[7]۔ بخاری، رقم 2794۔

[8]۔ ابن حجر، فتح الباری 13/ 68۔

کے عہد خلافت میں موجود تھے، اس مصالحت کی تائید کی تھی۔

2۔ اکابر صحابہ کے طرز عمل کے درست اور قابل اعتماد ہونے کے لیے اوزاعی نے ان کے دینی مقام اور امتیاز کا حوالہ دیا ہے، یعنی انھوں نے کتاب اللہ کو اپنے سامنے اترتے ہوئے دیکھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کتاب اللہ کے معانی و مطالب کی تعلیم حاصل کی۔ یہ حضرات علم دین کے حامل اور اس کے محافظ تھے اور ان کی حیثیت ہدایت کے چراغ کی ہے۔ یہ اسی نوعیت کا استدلال ہے جو ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے ایک اثر میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ:

إِنَّ اللّٰهَ نَظَرَ فِي قُلُوبِ الْعِبَادِ فَوَجَدَ قُلُوبَ أَصْحَابِهِ خَيْرَ قُلُوبِ الْعِبَادِ، فَجَعَلَهُمْ وُزَرَاءَ نَبِيِّهِ، يُقَاتِلُونَ عَلَى دِينِهِ، فَمَا رَأَى الْمُسْلِمُونَ حَسَنًا فَهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ حَسَنٌ، وَمَا رَأَوْا سَيِّئًا فَهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ سَيِّئٌ.

(مسند احمد، رقم 3468)

''اللہ تعالیٰ نے بندوں کے دلوں کی کیفیت دیکھی تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کے دلوں کو سب کے دلوں سے بہتر پایا، چنانچہ ان کو اپنے نبی کے مددگار ساتھی بنا دیا جو آپ کے دین کے لیے جہاد و قتال کرتے ہیں۔ پس اہل ایمان، (یعنی صحابۂ کرام) جس چیز کو اچھا سمجھیں، وہ اللہ کے نزدیک بھی اچھی ہے اور اہل ایمان جس چیز کو برا جانیں، وہ اللہ کے ہاں بھی بری ہے۔''

اوزاعی نے مزید واضح کیا ہے کہ مصالحت کا یہ عمل بہ ذات خود بھی مطلوب اور مستحسن تھا، کیونکہ اس کے ذریعے سے مسلمانوں کا سیاسی افتراق دوبارہ اجتماعیت میں بدل گیا تھا اور اسی لیے اکابر صحابہ و تابعین نے اس سے الگ تھلگ رہنے کے بجاے اس کی مکمل تائید کی تھی۔

## تخریج اور اختلاف طرق

ابوزرعہ کی سند سے اس اثر کو الجورقانی نے ''الاباطیل والمناکیر والصحاح والمشاہیر''[9] میں اور

---

9۔ 1/385۔

ابن کثیر نے ”البدایۃ والنہایۃ“[10] میں بھی نقل کیا ہے۔

## (13)

عَنْ أَبِي حَمْزَةَ، عَنْ إِبْرَاهِيمَ، قَالَ : لَوْ أَنَّ أَصْحَابَ مُحَمَّدٍ صلى الله عليه وسلم لَمْ يَمْسَحُوا إِلا عَلَى ظُفُرٍ مَا غَسَلْتُهُ الْتِمَاسَ الْفَضْلِ، وَحَسْبُنَا مِنْ إِزْرَاءٍ عَلَى قَوْمٍ أَنْ نَسْأَلَ عَنْ فِقْهِهِمْ وَنُخَالِفَ أَمْرَهُمْ. (ابن سعد، الطبقات الکبریٰ، رقم 7990)

”ابو حمزہ نے ابراہیم نخعی سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے کہا: اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ نے ایک ناخن کے برابر جگہ پر بھی صرف مسح کیا ہو تو میں زیادہ اجر حاصل کرنے کے لیے اس کو نہیں دھوؤں گا۔ ہماری جانب سے کسی گروہ کی تحقیر اور بے وقعتی کے لیے یہی کافی ہے کہ ہم ان کے علم و فقہ کی جستجو تو کریں، لیکن ان کے عمل کی مخالفت کریں۔“

## لغوی تشریح

’إزراء‘، یعنی بے وقعت اور حقیر سمجھنا۔

## صاحب اثر کا تعارف

ابراہیم بن یزید النخعی، جلیل القدر تابعی تھے۔ قبیلہ نخع سے تعلق رکھنے والے جلیل القدر تابعی علقمہ بن قیس کے بھتیجے اور اسود بن یزید اور عبد الرحمٰن بن یزید کے بھانجے تھے۔ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے نام ور تلامذہ، مسروق، اسود اور علقمہ سے کسب فیض کیا۔ بچپن میں بعض مواقع پر علقمہ اور اسود کے ہمراہ ام المومنین سیدہ عائشہ کے پاس بھی حاضر ہوئے۔ متعدد صحابہ کا زمانہ پایا، لیکن کسی صحابی سے براہ راست احادیث روایت کرنے کا موقع نہیں ملا۔ سنہ 39ھ یا 47ھ میں ولادت اور 96ھ میں وفات پائی۔[11]

---

[10]۔ 11/434۔

[11]۔ ذہبی، سیر اعلام النبلاء 4/529-521۔

## شرح ووضاحت

مراد یہ ہے کہ کسی دینی عمل کی ادائیگی میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ سے آگے بڑھنا اور اس کو موجب اجر سمجھنا درست نہیں ہے۔ اگر صحابہ نے ناخن کے برابر جگہ پر بھی صرف مسح کرنے کو کافی سمجھا ہو تو زیادہ اجر کی نیت سے اس کو دھونا قابل تحسین نہیں ہے۔ ابراہیم نخعی نے اس کو صحابہ کی تحقیر کے ہم معنی قرار دیا کہ صحابہ کے علم وتفقہ کی تو جستجو کی جائے اور ان سے رہنمائی حاصل کرنے کی کوشش کی جائے، لیکن عمل میں ان کے خلاف طریقہ اختیار کیا جائے۔

اہل تشیع کے بعض علما نے ابراہیم نخعی کے اس اثر کو وضو میں پاؤں پر مسح کرنے کی تائید میں پیش کیا ہے۔ یہ مسئلہ تابعین کے مابین مختلف فیہ رہا ہے اور بعض تابعین آیت وضو کے ظاہری اسلوب سے یہ اخذ کرتے تھے کہ سر کی طرح وضو میں پاؤں پر بھی مسح کرنا ہی مطلوب ہے۔[12] تاہم، ابراہیم نخعی کی رائے یہ نہیں تھی۔ ان کی یہ رائے منقول ہے کہ 'عاد الامر إلی الغسل'،[13] یعنی آیت میں 'وَاَرْجُلَكُمْ' کا تعلق 'فَاغْسِلُوْا' سے ہے اور ان کا دھونا مطلوب ہے۔ اس کی روشنی میں زیر بحث اثر میں بہ ظاہر تمثیل کے اسلوب میں صحابہ کی اتباع کی اہمیت واضح کی گئی ہے۔ پاؤں کو دھونے یا اس پر مسح کرنے کے مسئلے سے اس کا تعلق نہیں ہے۔

## تخریج اور اختلاف طرق

ابراہیم نخعی کا یہ اثر بہ ظاہر ابن سعد کے علاوہ کسی دوسرے ماخذ میں نقل نہیں ہوا۔

(14)

ثنا عُبَيْدُ اللّٰهِ بْنُ مُحَمَّدٍ، قَالَ: سَمِعْتُ شَيْخًا يَذْكُرُ عَنْ مُحَمَّدٍ، قَالَ: وَسُئِلَ مَرَّةً عَنْ فُتْيَا فَأَحْسَنَ الْإِجَابَةَ فِيهَا فَقَالَ لَهُ رَجُلٌ: وَاللّٰهِ يَا أَبَا بَكْرٍ لَأَحْسَنْتَ الْفُتْيَا فِيهَا أَوِ الْقَوْلَ فِيهَا، قَالَ: وَعَرَّضَ كَأَنَّهُ يَقُولُ: مَا كَانَتِ الصَّحَابَةُ لِتُحْسِنَ أَكْثَرَ مِنْ هَذَا،

---

[12]۔ المصنف لابن ابی شیبہ، رقم 178، 184۔

[13]۔ المصنف لابن ابی شیبہ، رقم 195۔

فَقَالَ مُحَمَّدٌ: لَوْ أَرَدْنَا فِقْهَهُمْ لَمَّا أَدْرَكْتُهُ عُقُولُنَا. (حلیۃ الاولیاء لابی نعیم 2/263)

”محمد بن سیرین سے ایک دفعہ ایک مسئلہ پوچھا گیا تو انھوں نے اس کا بہت عمدہ جواب دیا۔ ایک شخص نے کہا: اے ابو بکر، آپ نے اس کا بہت ہی عمدہ جواب دیا ہے۔ پھر اس نے کچھ ایسی بات کہی، جس کا مطلب یہ بنتا تھا کہ صحابہ بھی اس سے اچھا جواب نہ دے سکتے۔ اس پر محمد بن سیرین نے کہا کہ اگر ہم صحابہ کی فقہ تک پہنچنے کا ارادہ کریں تو ہماری عقلیں اس کو نہیں پا سکیں گی۔“

## صاحب اثر کا تعارف

ابو بکر محمد بن سیرین، اکابر تابعین میں سے ہیں۔ 32ھ میں بصرہ میں ولادت ہوئی۔ ان کے والد سیرین، سیدنا انس کے غلام تھے اور بدل کتابت ادا کر کے ان سے آزادی حاصل کی تھی۔ سیرین کا نکاح سیدنا ابو بکر کی باندی صفیہ سے ہوا تھا، جن سے محمد بن سیرین کی ولادت ہوئی۔ ابن سیرین کو تیس کے قریب صحابہ کو دیکھنے اور ابو ہریرہ، انس بن مالک، عبد اللہ بن عمر، عمران بن حصین، عبد اللہ بن عباس اور عدی بن حاتم رضی اللہ عنہم جیسے اصحاب سے روایت حدیث کا شرف حاصل ہوا۔ ان کے بھائی انس بن سیرین اور ہمشیرہ حفصہ بنت سیرین بھی دور تابعین میں حدیث کے معروف رواۃ میں سے ہیں۔ محمد بن سیرین، فقہ و حدیث کے علاوہ خوابوں کی تعبیر میں بھی خداداد مہارت کے حامل تھے۔ 110ھ میں بصرہ میں ہی وفات پائی۔[14]

## شرح و وضاحت

ابن سیرین نے سائل کی طرف سے تحسین کے اس انداز کو ناپسند کیا کہ بعد کے لوگوں کے علم کا تقابل صحابہ کے ساتھ کیا جائے۔ مراد یہ ہے کہ یہ تقابل ادب کے پہلو سے بھی غیر مستحسن ہے اور اس پہلو سے بھی کہ بعد والوں کو دین میں جو فہم اور بصیرت حاصل ہوئی ہے، وہ صحابہ کے علم و فضل سے استفادہ کی بدولت ہی حاصل ہوئی ہے اور اس کے باوجود بعد والوں کے لیے بہ حیثیت

---

[14] ۔ سیر اعلام النبلاء 4/606۔

مجموعی صحابہ کے علم و تفقہ کے مقام تک پہنچنا ممکن نہیں ہے۔

## تخریج اور اختلاف طرق

محمد بن سیرین کا یہ اثر بہ ظاہر ''حلیۃ الاولیاء'' کے علاوہ کسی دوسرے ماخذ میں نقل نہیں ہوا۔

(15)

عَنْ عَبْدِ الْعَزِيزِ بْنِ عُبَيْدِ اللّٰهِ، قَالَ: قَالَ رَجُلٌ لِعَامِرٍ: اتَّفَقَ شُرَيْحٌ وَابْنُ مَسْعُودٍ، فَقَالَ عَامِرٌ: بَلْ تَبِعَ شُرَيْحٌ ابْنَ مَسْعُودٍ وَإِنَّمَا يَتَّفِقُ أَصْحَابُ النَّبِيِّ صلى الله عليه وسلم وَالنَّاسُ لَهُمْ تَبَعٌ. (الہروی، ذم الکلام واہلہ، رقم 794)

''عبد العزیز بن عبید اللہ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے عامر شعبی کے سامنے یوں کہا کہ (اس معاملے میں) شریح اور عبد اللہ بن مسعود متفق ہیں۔ شعبی نے کہا کہ نہیں، بلکہ یوں کہو کہ شریح نے عبد اللہ بن مسعود کی پیروی کی ہے۔ آپس میں اتفاق (یا اختلاف) کرنا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کا منصب ہے۔ باقی لوگوں کا درجہ ان کے بعد ہے۔''

## صاحب اثر کا تعارف

عامر بن شراحیل الشعبی، تابعین کے دور میں کوفہ کے ممتاز ترین فقہا میں شمار ہوتے ہیں۔ 28ھ کے لگ بھگ پیدا ہوئے۔ 50 کے قریب صحابہ سے روایت حدیث کا شرف حاصل کیا، جن میں سیدنا علی، سعید بن زید، سعد بن ابی وقاص، ابو موسیٰ اشعری، ابو ہریرہ، ابن عمر، سیدہ عائشہ اور ابن عباس رضی اللہ عنہم جیسے اکابر صحابہ بھی شامل ہیں۔ شعبی کے اپنے بیان کے مطابق انھیں 500 کے قریب صحابہ کو دیکھنے کا موقع ملا۔ محمد بن سیرین سے ان کے علم و فضل کی گواہی یوں منقول ہے کہ شعبی سے علمی معاملات میں رائے اور فتویٰ طلب کیا جاتا تھا، حالاں کہ صحابہ موجود تھے۔ 104ھ میں وفات پائی۔[15]

---

[15] ۔ خطیب بغدادی، تاریخ بغداد 14 / 143۔ ذہبی، سیر اعلام النبلاء 4 / 405-395۔

## شرح و وضاحت

قاضی شریح، جلیل القدر تابعی تھے اور ان کے علم و تفقہ کو دیکھ کر سیدنا عمر نے انھیں کوفہ کا قاضی مقرر کیا تھا۔ تاہم ان کے علم و فضل کے باوجود شعبی نے اس کو خلاف ادب تصور کیا کہ ان کا ذکر عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے ساتھ برابری کے اسلوب میں کیا جائے۔ انھوں نے بتایا کہ باہم اتفاق یا اختلاف کرنا، یہ صحابہ ہی کے لیے روا ہے۔ بعد کے لوگ صحابہ کی پیروی میں ہی کسی رائے سے اختلاف یا اتفاق کا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔

## تخریج اور اختلاف طرق

شعبی کا یہ اثر بہ ظاہر الہروی کی "ذم الکلام واہلہ" کے علاوہ کسی دوسرے ماخذ میں نقل نہیں ہوا۔

[باقی]

نوا کہ چاہے تو پتھر کو جوے آب کرے
غیابِ قدرتِ یزداں کو بے نقاب کرے

سید منظور الحسن

# ”23 اعتراضات سیریز“
## تصنیفی کام کا طریقۂ کار

[”نقطۂ نظر“ کا یہ کالم مختلف اصحابِ فکر کی نگارشات کے لیے مختص ہے۔ اس میں شائع ہونے والے مضامین سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

### ”23 اعتراضات سیریز“ کا تعارف

* یہ ویڈیو سیریز ”غامدی صاحب کے فکر پر 23 اعتراضات کے جواب میں“ کے عنوان سے ”غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ، امریکہ“ کے زیر اہتمام جاری ہے۔

* اِس سیریز میں روایتی مذہبی فکر کے وہ اعتراضات زیرِ بحث ہیں، جو غامدی صاحب کے افکار پر، بالعموم کیے گئے ہیں اور جنھیں علما کی اجماعی آرا کے مقابل میں اُن کے تفردات کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

* یہ درحقیقت قرآن و سنت اور حدیث و سیرت کے مختلف مباحث کی رائج تعبیرات ہیں۔ غامدی صاحب نے اِنھیں قرآن و سنت کے نصوص اور حدیث و سیرت کے حقائق کے خلاف قرار دے کر جزواً یا کلیتاً قبول کرنے سے انکار کیا ہے۔

* اِس سلسلۂ مباحث میں سوال و جواب اور بحث و مکالمے کا اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔
* شریکِ گفتگو محمد حسن الیاس صاحب ہیں۔ اُنھوں نے تمام بحثوں کو بالاستیعاب ترتیب دے کر بہ تمام و کمال استاذِ گرامی کے سامنے پیش کیا ہے۔
* استاذِ گرامی نے جوابی گفتگو میں روایتی نقطۂ نظر کی تشریح کی ہے، اُس کے دلائل کا تجزیہ کیا ہے اور اُس کے مقابل میں اپنے موقف کو پوری وضاحت کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔

## ویڈیوز میں گفتگو کی نوعیت

* ان ویڈیوز میں جو گفتگوئیں کی گئی ہیں، اُنھیں استاذِ گرامی کی دیگر گفتگوؤں پر محمول نہیں کرنا چاہیے۔
* اِن کی نوعیت یہ ہے کہ گویا اعلیٰ علمی تحقیقی مقالات کو بول کر بیان کیا جا رہا ہے۔
* چنانچہ ہر بحث عموماً درجِ ذیل چار اجزا کو محیط ہوتی ہے:

### 1۔ موضوع کا تعارف

- اِس ضمن میں موضوع کا پس منظر اور اصولی تعارف بیان کیا جاتا ہے۔

### 2۔ اعتراض کی تنقیح اور تردید

- اعتراض کے نکات کو متعین کر کے معترضین کے حوالہ جات کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔
- اعتراض کو محض پیش نہیں کیا جاتا، بلکہ اُس کے علمی استدلال کو بھی پوری وضاحت کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔
- پھر استدلال کے جملہ نکات کی تنقیح کی جاتی ہے اور اُن کے اسقام کو واضح کیا جاتا ہے۔
- اعتراض کی تردید کے لیے حسبِ ضرورت قرآن، سنت، حدیث، لغت، تاریخ سے استناد کو پیش کیا جاتا ہے۔
- تائید اور تاکید کے لیے امہات کتب سے اقتباسات بھی پڑھ کر سنائے جاتے ہیں۔

### 3۔ غامدی صاحب کے موقف کی وضاحت

- اعتراض کے تناظر میں غامدی صاحب کے موقف کی تفصیل کی جاتی ہے۔

-اِس ضمن میں اُن عقلی یا نقلی مقدمات کو پیش کیا جاتا ہے، جو مثبت یا منفی طور پر بحث کی اساسات کو متعین کرتے ہیں۔

-پھر نصوص میں موقف کی اساسات کو متعین کیا جاتا ہے۔

-استدلال کے نکات کو متعین کر کے مثبت انداز میں محکم اور منضبط طریقے سے پیش کیا جاتا ہے۔

-اس دوران میں ضمنی اور اطلاقی بحثوں سے ممکن حد تک گریز کیا جاتا ہے تاکہ بنیادی استدلال کے خطِ مستقیم کا کسی آمیزش یا ابہام کے بغیر ادراک ہو سکے۔

-استدلال کی وضاحت کے بعد موقف کو اُس کی مجموعی صورت میں پیش کیا جاتا ہے۔ اِس موقع پر غامدی صاحب کی تصانیف سے متعلقہ اقتباسات پڑھ کر سنائے جاتے ہیں۔

-موقف کی تائید میں یا تقابل میں حسبِ ضرورت جلیل القدر اہلِ علم کی آرا کو بھی پیش کیا جاتا ہے۔

### 4۔ متفرقات

آخر میں درجِ ذیل چیزیں زیرِ گفتگو آتی ہیں:

ضمنیات

اطلاقات

اشکالات

متعلقات

## تصنیفی کام کی ضرورت

*23 اعتراضات کی سیریز کا کام گفتگو کی صورت میں ہے۔

*اِس میں شبہ نہیں کہ متعلقہ اعلیٰ علمی اور تحقیقی مواد کلی طور پر اِس کے اندر موجود ہے، مگر اِس کے باوجود اِس کی نوعیت کتاب کی نہیں ہے۔ طلبہ اور محققین اِس سے اُس طرح مستفید نہیں ہو سکتے، جس طرح کسی علمی کتاب مثلاً ''میزان'' یا ''برہان'' سے مستفید ہو سکتے ہیں۔

*یعنی متون مشہود طور پر دستیاب نہیں ہوتے، حوالہ جات سامنے نہیں آتے اور مباحث سے

بار بار مراجعت دشوار ہوتی ہے۔ اسی طرح پوری بحث ابواب اور فصول کی صورت میں سامنے نہیں آتی۔

* چنانچہ خالص طالب علمانہ اور محققانہ ضرورتوں کے پیشِ نظر اِن گفتگوؤں کو کتابی صورت میں مرتب کرنا ضروری ہے۔

# کام کا طریقۂ کار

## پہلا مرحلہ: مصنف کا انتخاب

* یہ کام ایسے مصنفین کو کرنا چاہیے جو:

- جناب جاوید احمد غامدی کی فکری اساسات، اُن کے زاویۂ نظر اور طرزِ استدلال کو بہ خوبی سمجھتے ہوں۔
- اردو زبان و بیان کی کماحقہ استعداد رکھتے ہوں۔
- ذاتی نقطۂ نظر سے قطع نظر کرتے ہوئے دوسرے صاحبِ علم کی بات کو بے کم و کاست بیان کرنے کا ہنر جانتے ہوں۔
- ایک ایسے کام کو اپنے لیے باعثِ اعزاز سمجھتے ہوں، جسے بادی النظر میں محض تلخیص، ترجمانی اور توضیح قرار دیا جاسکتا ہے۔
- خالص علمی مقالات لکھنے کا ذوق اور تجربہ رکھتے ہوں۔

## دوسرا مرحلہ: موضوع کا انتخاب

* موضوع کا انتخاب مصنفین کو اپنے اختیار سے کرنا چاہیے۔

* اِس ضمن میں اِس امر کا لحاظ ضروری ہے کہ موضوع مصنف کے ذوق، دل چسپی اور علمی استعداد کے مطابق ہو۔

* مثال کے طور پر اعتراضات سیریز کے مختلف موضوعات میں سے ''فطرت'' کے موضوع

پر اُس شخص کو کام کرنا چاہیے، جسے فلسفہ اور علم الاخلاق کے مباحث سے دل چسپی ہو۔ ''نزول مسیح''، ''ظہور مہدی'' پر اُسے کام کرنا چاہیے، جو علوم الحدیث کا پس منظر رکھتا ہو۔ ''قراءت کا اختلاف'' علوم القرآن سے دل چسپی کا تقاضا کرتا ہے۔ ''حلال و حرام''، ''غنا اور موسیقی''، فقہی ذہن رکھنے والے لوگوں کو منتخب کرنا چاہیے۔ ''پہلی وحی'' کو اُنھیں منتخب کرنا چاہیے، جنھیں تاریخ و سیرت کے مطالعے کا شوق ہو۔ ''سنت''، ''حدیث''، ''اجماع'' اور ''اتمام حجت'' ان لوگوں کو اختیار کرنا چاہیے، جو علمِ اصول دین سے شغف رکھتے ہوں۔

## تیسرا مرحلہ: گفتگو کا فہم

* ویڈیو میں کی گئی گفتگو کا فہم حاصل کرنے کے لیے درجِ ذیل طریقۂ کار مفید ہو سکتا ہے:

### 1۔ عام سماعت

اِس میں موضوع کی تمام ویڈیوز کو ابتدا سے اختتام تک پوری توجہ سے سنا جائے۔ نوٹس نہ لیے جائیں، بلکہ ایک عام سامع کی طرح پوری بات کا عمومی فہم حاصل کیا جائے۔

### 2۔ علمی سماعت

اِس میں تمام ویڈیوز کو دوبارہ سننے کا اہتمام کیا جائے۔ باقاعدہ نوٹس لیے جائیں۔ جس بات پر ذہنی گرفت مشکل ہو، اُسے بہ تکرار سنا جائے۔ اگر کوئی اشکالات، سوالات، اعتراضات پیدا ہوں تو اُنھیں ساتھ ساتھ نوٹ کر لیا جائے۔

### 3۔ ٹرانسکرپشن کا مطالعہ

ویڈیوز کی لفظ بہ لفظ ٹرانسکرپشن کو ادارے سے حاصل کر کے اُس کا مطالعہ کر لیا جائے۔ اس موقع پر:

- ہر بحث کو عنوان دے دیا جائے تاکہ مراجعت میں دشواری نہ ہو اور گفتگو کا مطلوبہ مقام بہ آسانی تلاش کیا جا سکے۔
- اہم جملوں کو انڈر لائن کر کے یا رنگ بدل کر نمایاں کر لیا جائے۔ اِس کا فائدہ یہ ہو گا کہ لکھنے کے دوران میں یہ جانا جا سکے گا کہ زیرِ تحریر بات کو ادا کرنے کے لیے کیا الفاظ، کیا اصطلاحات اور کیا اسلوبِ بیان اختیار کیا گیا ہے۔

- مطالعے کے دوران میں اگر کوئی نکتہ ذہن میں آئے، جسے کتاب میں شامل کرنا مفید ہو تو اسے بریکٹ میں یا فٹ نوٹ کے طور پر لکھ لیا جائے۔

- ویڈیوز میں گفتگو کا طریقہ یہ ہے کہ کوئی بنیادی یا ضمنی بحث پہلے ابتداءً بیان ہوتی ہے، پھر اعتراضات کے جواب میں توضیحاً بیان ہوتی ہے، کبھی کسی دوسری بحث کی وضاحت کے لیے اشارۃً یا ضمناً بھی بیان ہو جاتی ہے، پھر خلاصۃً بیان ہوتی ہے۔ یہ نہایت مفید ہو گا کہ ایک بحث کی ان تمام گفتگوؤں کو ایک الگ فائل میں یک جا کر لیا جائے۔ اِس طرح ایک بحث مختلف اسالیب میں سامنے آجائے گی۔ اس مواد کو سامنے رکھ کر جب مصنف متعلقہ بحث کو لکھنے لگے گا تو اُسے خاطر خواہ مدد مل جائے گی۔

## 4۔ موضوع سے متعلق دیگر ویڈیوز

- اگر غامدی صاحب نے متعلقہ موضوع پر یا اُس کی کسی بحث پر ما قبل یا مابعد کوئی گفتگو کی ہے تو اُس کا سننا بھی مفید ہو سکتا ہے۔

- خصوصاً بعد ازاں کی گئی گفتگو کو ضرور سننا چاہیے۔ اس میں یہ امکان ہوتا ہے کہ استدلال یا پریزنٹیشن کا کوئی نیا رخ اختیار کیا گیا ہو، جو تالیف کو مزید موثر کر سکے۔

- تاہم، اس مقصد کے لیے بہت پرانی گفتگوؤں کو سننے سے گریز کرنا چاہیے۔

## 5۔ موضوع سے متعلق تحریریں

* 23 اعتراضات سیریز کے کم و بیش تمام موضوعات پر استاذِ گرامی تفصیلاً یا اجمالاً خامہ فرسائی کر چکے ہیں۔

* چنانچہ جس موضوع پر مقالہ لکھنا مقصود ہو، اُس کے حوالے سے اُن کی تصانیف میں جو کچھ دستیاب ہے، اُس کا دقتِ نظر سے مطالعہ کیا جائے اور اہم اقتباسات کو متعلقہ بحث کی فائل میں محفوظ کر لیا جائے۔

* یہ ضروری ہو گا کہ ان اقتباسات کو بر سرِ موقع جا بہ جا استعمال کیا جائے۔

* اِس ضمن میں امام امین احسن اصلاحی کی تحریروں خصوصاً ”تدبر قرآن“ کا مطالعہ بھی مفید ہو گا۔ ”البیان“ کا اسلوب بیان اجمالی، جب کہ ”تدبر قرآن“ کا تفصیلی ہے۔ چنانچہ جن مباحث

میں دونوں تفاسیر متفق ہیں، اُن میں تفصیلی بیان کا مطالعہ تفہیم میں مزید رسوخ پیدا کر سکتا ہے۔

## چوتھا مرحلہ: ضروری مواد کا اجمالی مطالعہ

* یہ مرحلہ درج بالا تیسرے مرحلے سے پہلے بھی اختیار کیا جا سکتا ہے۔

* اِس مرحلے میں مصنف موضوع سے متعلق نمایندہ اور مفصل اور منضبط تالیفات کا مطالعہ کرے گا۔

* اِس کے نتیجے میں اُسے موضوع کا وسیع اور جامع فہم حاصل ہو گا۔ وہ اُس پورے تناظر سے آگاہ ہو جائے گا، جس میں کھڑے ہو کر استاذِ گرامی نے گفتگو کی ہے۔

## پانچواں مرحلہ: تصنیف کا خاکہ

* تصنیفی کام شروع کرنے سے پہلے خاکۂ تصنیف کو مرتب کرنا ضروری ہے۔ اِس مقصد کے لیے درجِ ذیل کام مفید ہوں گے:

- استاذِ گرامی کی گفتگو کے مباحث کے عنوانات کی مکالمے کی ترتیب کے مطابق فہرست بنالی جائے۔

- اِس فہرست کو سامنے رکھ کر خاکۂ تصنیف کو تین یا تین سے زیادہ ابواب میں تقسیم کیا جائے اور اُن کے تحت فصول اور ذیلی بحثوں کی فہرست بندی کی جائے۔

- تالیف کی ضرورت متقاضی ہو تو جملہ مباحث کو گفتگو کی ترتیب سے مختلف ترتیب میں بھی مرتب کیا جا سکتا ہے۔

- اِس ضمن میں رہنمائی کے لیے 23 اعتراضات سیریز پر ماقبل کیے گئے کام پر بھی نظر ڈال لینی چاہیے۔

## چھٹا مرحلہ: خاکۂ تصنیف کی تصویب

* خاکۂ تصنیف کتاب کے عنوانات کی فہرست کی صورت میں سامنے آئے گا، جسے تصویب

کے لیے نگرانِ تصنیف، حسن الیاس صاحب اور استاذِ گرامی کو بھجوا دیا جائے گا۔

* اِس موقع پر گفتگو کی ترتیب کے مطابق مکالمے کے مباحث کی فہرست بھی ساتھ بھجوائی جائے تاکہ گفتگو کی ترتیب اور خاکے کی ترتیب میں اگر کوئی فرق ہے تو وہ نمایاں ہو سکے۔

## ساتواں مرحلہ: کسی ایک بحث کی تصنیف اور پیشکش

* اس سیریز پر کام کا آغاز کرنے والوں کے لیے مفید ہے کہ وہ ایک بحث لکھ کر اُسے نگران کی نظر ثانی کے لیے پیش کریں۔

* اِس ضمن میں اُس بحث کو لکھنا چاہیے، جسے مصنف نسبتاً آسان سمجھتا ہو۔

* اِس تحریر کا فائدہ یہ ہو گا کہ اگر مصنف کے فہم یا اسلوبِ نگارش میں بنیادی مسائل پائے جاتے ہیں تو وہ ابتدا ہی میں سامنے آ جائیں گے اور اُن کی ضروری اصلاح و تربیت کا اہتمام ہو سکے گا۔

* اِس موقع پر نگران کی ذمہ داری ہو گی کہ وہ مصنف کی ابتدائی تحریر کا بہ غور مطالعہ کرے اور اُسے زبان و بیان، فارمیٹ، کرافٹ اور اسٹرکچر کے حوالے سے ضروری رہنمائی فراہم کرے۔

* اس کے بعد اِس امر کا اندیشہ کم ہو جائے گا کہ مصنف کو کتاب کی تکمیل کے بعد اُسے نئے سرے سے تالیف کرنا پڑے۔

## آٹھواں مرحلہ: تصنیف کا باقاعدہ آغاز

* نگران کے اطمینان کے بعد مصنف کو کتاب کی باقاعدہ تصنیف کا آغاز کر دینا چاہیے۔

* اِس موقع پر اُسے تصنیف و تالیف کے جملہ تقاضوں کو بہ تمام و کمال ملحوظ رکھنا چاہیے اور اِس معاملے میں کسی تساہل کو ہرگز آڑے نہیں آنے دینا چاہیے۔

* اِس کے علاوہ مصنف کے لیے درجِ ذیل چیزوں کا التزام بھی ضروری ہے:

- اُسے ہر دم خیال رکھنا چاہیے کہ وہ اپنے موقف کو نہیں، بلکہ استاذِ گرامی کے موقف کو بیان کر رہا ہے۔

- چنانچہ اُسے اُن کے موقف کو بے کم و کاست بیان کرنے پر اکتفا کرنا چاہیے۔

-مکالمے کے مباحث میں اگر کوئی ترمیم مقصود ہے تو اُسے اُسی صورت میں کرنا چاہیے، جب متعلقہ بحث کتاب کی ضرورت سے غیر متعلق یا اضافی ہو۔

-مکالمے کے مباحث میں اگر کوئی اضافہ مقصود ہے تو اُسے اُسی صورت میں کرنا چاہیے، جب اُس کے بغیر کتاب میں کوئی خلا یا تشنگی باقی رہ جائے یا وہ استاذِ گرامی کی بات کی تائید یا شرح و وضاحت کے لیے مفید ہو۔

-کوئی بحث اگر استاذ کے اپنے قلم سے لکھی جا چکی ہے تو اُس کے اقتباسات کو لازماً شامل کیا جائے۔

*مصنف اگر بعض ضمنی مباحث کو خالص طالب علمانہ ضرورت کے تحت بالتفصیل لکھنا چاہتا ہے تو وہ اُنھیں ضمیمہ جات کے طور پر لکھ سکتا ہے۔

*مصنف کو ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے کہ وہ ایڈیٹرز کے لیے کم سے کم کام باقی رہنے دے۔ چنانچہ:

-اُسے حوالہ جات کی تحقیق، اقتباسات کی پڑتال، تراجم کی صحت اور اِس نوعیت کے لائبریری تحقیق کے جملہ امور کو باریک بینی سے اور بھرپور طریقے سے انجام دینا چاہیے۔

-اِسی طرح اُسے زبان کے اصول، بیان کے اسالیب، املا کے قواعد اور اوقاف کے رموز سے بہ خوبی آگاہ ہونا چاہیے اور اپنی تالیف میں اُنھیں پوری طرح بروے کار لانا چاہیے۔

## نواں مرحلہ: تصنیف کے ضروری اجزا کی شمولیت

*اِس مرحلے میں مصنف اِس امر کا جائزہ لے گا کہ آیا تصنیف کے تمام ضروری اجزا تحریر ہو کر ترتیب پا گئے ہیں۔

*تصنیف کے ضروری اجزا یہ ہیں:

-دیباچہ

-تعارف

-عند الضرورت موضوع کے اصولی مباحث کا بہ طورِ مقدمہ بیان

-موضوع کے جملہ مباحث پر معترضین کا موقف

-معترضین کے موقف پر نقد و جرح

- موضوع کے جملہ مباحث پر غامدی صاحب کا موقف
- دونوں مواقف کا تقابلی مطالعہ
- خلاصۂ مباحث
- عند الضرورت ضمیمہ جات

## دسواں مرحلہ: تصنیف کی تکمیل اور بنیادی ایڈیٹنگ

* مصنف کتاب کی تکمیل کے بعد خود اُس کی ایڈیٹنگ کا کام انجام دے گا۔ اِس سلسلے میں وہ درجِ ذیل امور انجام دے گا:

- کمپوزنگ
- پروف ریڈنگ
- اوقاف کی پڑتال
- املا کی پڑتال
- پیراگرافنگ
- عنوانات اور مرکزی اور ذیلی سرخیاں
- حواشی
- بنیادی فارمیٹنگ
- اقتباسات کی شمولیت

## گیارھواں مرحلہ: ایڈیٹرز کا ابتدائی کام

* کتاب مکمل ہونے کے بعد اُسے کسی ایک ایڈیٹر کے سپرد کر دیا جائے گا۔
* وہ اس پر درجِ ذیل امور انجام دے گا:

- کتاب کی مطلوبہ سائز اور اسٹرکچر کے لحاظ سے فارمیٹنگ
- پروف ریڈنگ
- اقتباسات کا اصل سے موازنہ (ٹیلی)

- عربی، انگریزی عبارات اور اشعار وغیرہ کی پڑتال
- فہرست سازی

## بارھواں مرحلہ: نگران کی نظر ثانی

* ایڈیٹنگ اور فارمیٹنگ کے مراحل سے گزر کر کتاب نگران کی نظر ثانی کے لیے ارسال کی جائے گی۔

* وہ جائزہ لے گا:

- آیا گفتگو کے تمام ضروری نکات کتاب کا حصہ بن گئے ہیں؟

مصنف نے اُن نکات میں اگر کوئی ترمیم و اضافہ کیا ہے تو کیا وہ مصنف کے مدعا سے متجاوز تو نہیں ہے؟

- ابواب وفصول کی تقسیم مفیدِ مطلب ہے؟
- جملہ مباحث بر محل ہیں، یعنی ترتیبِ بیان میں اُنھیں جہاں رقم ہونا چاہیے، وہیں رقم ہیں؟
- اُن کے بیان میں موزونیت کا مسئلہ تو نہیں ہے، یعنی جس بحث کو اختصار سے بیان ہونا ہے، وہ مفصل اور جسے تفصیل سے بیان ہونا ہے، وہ مختصر ہو گئی ہے۔

(ان امور کو مصنف کو بھی لازماً ملحوظ رکھنا چاہیے)

- کتاب کے اصل مشمولات میں مصنف نے اپنی رائے کا اظہار تو نہیں کیا؟
- کتاب اپنے کلام اور استدلال میں خطِ مستقیم میں چلتی ہے اور ابتدا سے انتہا تک کسی کجی اور انتشار کے بغیر مکمل ہوتی ہے؟

محمد ذکوان ندوی

# جنس یا انسان

## عورت اور مرد کا کردار (رول) اور مقام دین فطرت کے تناظر میں

خدا کی وسیع تر اسکیم کے مطابق، اسلام میں عورت اور مرد، دونوں اپنی فطری تقسیم کے باوجود 'انسان' ہونے کے اعتبار سے، یکساں حیثیت رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں عورت اور مرد کو الگ الگ خطاب کرتے ہوئے — کہیں اُنھیں محض "اے عورتو اور اے مردو!" جیسے الفاظ میں: 'یاأیھا النساء'، 'ویاأیھا الرجال' کہہ کر خطاب نہیں کیا گیا۔ اِس کے برعکس، قرآن میں عورت اور مرد، دونوں کو 'انسان' کی حیثیت سے مخاطب کرتے ہوئے: 'یاأیھا الناس'، 'ویاأیھا الإنسان' (اے لوگو، اے انسانو!) کہہ کر خطاب کیا گیا ہے۔

چنانچہ قرآن میں جہاں اِس طرح عورت اور مرد کا تذکرہ ہوا ہے، وہاں صنفی تفریق کے طور پر اُنھیں الگ الگ خطاب کرنے کے بجاے 'بَعْضُکم مِنْ بَعْض' (آل عمران 3: 195) جیسے انقلابی الفاظ میں اُن کا تذکرہ کیا گیا ہے، یعنی صنفی طور پر عورت اور مرد ایک دوسرے سے مختلف ہونے کے باوجود انسانیت کا ایک ابدی اور اٹوٹ سنگم ہیں۔ وہ ایک ہی وجود کے دو مختلف مظہر کی حیثیت رکھتے ہیں۔

یہ کوئی سادہ بات نہیں۔ قرآن نے اِس اسلوب کے ذریعے سے ہمیشہ کے لیے اُس قدیم اور جدید جاہلی تصور کا خاتمہ کر دیا، جس کے تحت "عورت اور مرد" کی فطری تقسیم کو انسانی تفریق

کے ہم معنی بنا دیا گیا تھا۔ قرآن میں ”عورت اور مرد“، دونوں کو ”انسان“ تسلیم کرنے کے بعد اُن کے درمیان موجود صنفی فرق (gender differences) کو برتری یا کم تری کا معیار ہرگز قرار نہیں دیا گیا۔ اِس کے بجاے دونوں کو اپنے اپنے میدانِ عمل میں ذاتی رول کی ادائیگی اور اپنے اندر پائے جانے والے فطری و اضافی خصائص (النساء 4: 32) کے ادراک کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔ اِسی حقیقت کو استاد وحید الدین خاں نے انتہائی خوب صورتی کے ساتھ اِن الفاظ میں بیان کیا تھا ـــــ رول میں مختلف، مقام میں برابر:

Different in role, equal in respect

عورت کا اصل میدان گھر اور خاندانی زندگی کی تعمیر و تشکیل ہے، جس پر پورے انسانی معاشرے کے استحکام کی بنیاد قائم ہے۔ اِسی طرح، مرد کا اصل میدان باہر کی دنیا ہے، جس پر انسان کا معاشی نظام مبنی ہے۔ یہی باہر کی دنیا وہ میدان ہے جس سے انسانی زندگی کی تمام سیاسی، اخلاقی اور دعوتی سرگرمیاں جاری اور تمام تعلیمی و تربیتی ادارے اِسی سے وابستہ ہیں۔

گھر اور باہر کے اِن دونوں اداروں میں سے اگر ایک ادارہ بھی متاثر ہو تو اُس کا حشر وہی ہو گا جس کو ’ترقی‘ جیسے پر فریب فلسفوں کی شاطرانہ ملمع کاری کے باوجود، اِس وقت مغرب سے لے کر مشرق تک ہر جگہ دیکھا جا سکتا ہے۔ موجودہ مذہبی اور غیر مذہبی دنیا کے بڑے حصے میں برپا اکثر فکری اور عملی فسادات اِسی عمومی توازن اور اِسی فطری تقسیم میں انحراف کا براہِ راست نتیجہ ہیں۔

عدنان اعجاز

# علاماتِ قیامت

## کون سی پوری ہو گئیں اور کون سی باقی

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتابوں اور خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے ہم مسلمانوں کو قربِ قیامت کی ایسی واضح نشانیوں سے آگاہ فرمایا ہے جن سے نہ صرف ہم اپنے رب اور پیغمبر کی حقانیت کی رواں تصدیق کر سکتے ہیں، بلکہ ان کی بنیاد پر ہر دور میں اپنی حکمتِ عملی اور ردِّ عمل کو بھی درست منہج پر استوار کر سکتے ہیں۔

مگر میں دیکھ رہا ہوں کہ ان نشانیوں کی غلط تعبیرات کے باعث من حیثُ الامّت ہم مرحلۂ تاریخ غلط متعین کر رہے ہیں اور اسی لیے حکمتِ عملی بھی۔ میری تحقیق کے مطابق تقریباً سب نشانیاں پوری ہو چکی ہیں۔ نتائج پر بحث تو کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھتے ہیں، اس نشست میں قربِ قیامت کی نشانیوں پر نہایت مختصر بحث کرتے ہیں اور یہ جانتے ہیں کہ ان میں سے کس نشانی کا کیا مطلب تھا اور اگر وہ پوری ہو گئی تو کب اور کہاں پوری ہوئی؟

اگر قربِ قیامت کی چھوٹی بڑی سب نشانیوں کو ملا لیا جائے تو ان کی تعداد شاید بیسیوں میں ہو۔ میں نے، مگر چودہ بڑی نشانیوں کی فہرست بنائی ہے، جن کی وجہِ انتخاب آپ کو ساتھ ساتھ سمجھ میں آتی جائے گی۔

### علامات کب اور کہاں پوری ہوئیں؟ پوری ہو گئیں یا نہیں؟

بعثت المسیح عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام

بعثت النبی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

غلامی کا خاتمہ

عربوں کا عمارتوں کی بلندی میں مقابلہ

زمین کا جانور

سورج کا مغرب سے نکلنا

دجّال

نزول عیسٰی ابن مریم علیہما السلام

یاجوج وماجوج کا خروج

زمین کا دھنسنا: مشرق، مغرب، عرب

دھواں

یمن سے ایک آگ کا نکلنا

یہ ہیں وہ چودہ نشانیاں۔ یہ آپ کو گننے میں بارہ لگیں گی، مگر ان میں سے ایک دراصل تین جزوی نشانیوں پر مشتمل ہے، اس لیے شمار میں چودہ ہی ہیں۔ آیئے، ایک ایک کر کے سب کو زیرِ بحث لاتے ہیں۔

پہلی دو نشانیاں سب سے بڑی اور اہم نشانیاں ہیں، جن کا تذکرہ خود اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید اور بائیبل میں فرمایا ہے۔ یعنی بعثتِ المسیح عیسٰی ابن مریم علیہما السلام اور بعثت النبی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

ممکن ہے، اس فہرست میں آپ کو یہ دو نشانیاں کچھ عجیب محسوس ہوں، اس لیے ان کی مختصر وضاحت کر لیتے ہیں۔

## المسیح عیسٰی ابن مریم علیہما السلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت

اللہ تعالیٰ وقت کے جس پیمانے پر ہم انسانوں کے ساتھ معاملہ فرما رہے ہیں، اس کی اکائی کم سے کم ہزار سالہ ہے۔ چنانچہ وہ دو اہم ترین واقعات جو انسانیت کی لاکھوں نہ سہی ہزاروں سال پر محیط زندگی میں اختتامی چکر، یعنی 'final lap' کے آغاز کا اعلان تھے، وہ انھی دونوں پیغمبروں کی بعثت تھی۔

چنانچہ المسیح، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں خاص قیامت کے حوالے سے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَاِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا وَاتَّبِعُوْنِ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ. (الزخرف 61:43)

”(اِن سے کہو، اے پیغمبر کہ) یقیناً وہ (یعنی عیسیٰ علیہ السلام) قیامت کی ایک بڑی دلیل ہے تو اُس کے برپا ہونے میں شک نہ کرو اور میری پیروی کرو۔ یہی سیدھی راہ ہے۔“

اور اسی طرح حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے قیامت کی ضروری علامات پوری ہو جانے کے متعلق قرآن میں ہے کہ:

فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا السَّاعَةَ اَنْ تَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً ۚ فَقَدْ جَآءَ اَشْرَاطُهَا ۚ فَاَنّٰى لَهُمْ اِذَا جَآءَتْهُمْ ذِكْرٰىهُمْ. (محمد 18:47)

”تو اب یہ اِسی کے منتظر ہیں کہ قیامت اِن پر اچانک آ جائے۔ سو یاد رکھیں کہ اُس کی علامتیں ظاہر ہو چکی ہیں۔ پھر جب وہ اِن پر آ ہی جائے گی تو اِن کے لیے اِن کے سمجھنے کا موقع کہاں ہو گا!“

اور خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

بعثت أنا والساعة كهاتين. (بخاری، رقم 6504)

”میں اور قیامت اس طرح ساتھ بھیجے گئے ہیں۔ (اور اپنے ہاتھ مبارک کی دو انگلیاں ملا کر دکھائیں)۔“

اسی نوعیت کی عبارتیں بائیبل میں بھی ہیں، مگر ان میں جانے کا یہاں وقت نہیں۔ چنانچہ یہود و نصاریٰ کے ہاں بھی قربِ قیامت کا تقریباً یہی نقشہ ہے، لیکن چونکہ یہود نے ان دونوں پیغمبروں کو نہیں مانا اور نصاریٰ نے ایک کو، اس لیے نقشہ ایک ہونے کے باوجود طے کردہ سنگِ میل مختلف ہو گئے اور یہود و نصاریٰ نقشے کے گزرے ہوئے حصوں میں کھو کے رہ گئے ہیں۔

چنانچہ یہ دونوں نشانیاں اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ پوری ہو چکیں اور ان کی تاریخی تعیین میں کسی بحث کی ضرورت نہیں۔

## غلامی کا خاتمہ (1948ء اقوام متحدہ) اور عربوں کی عمارتوں کی بلندی میں مقابلہ بازی

اگلی دونوں نشانیاں اس حدیث میں وارد ہوئی ہیں، جو حدیثِ جبریل کے نام سے موسوم اور ذخیرۂ حدیث کی مستند ترین احادیث میں سے ہے۔ اس میں اسلام، ایمان اور احسان کے متعلق سوالات کے بعد حضرت جبرائیل علیہ السلام نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے قیامت کی نشانیوں کے متعلق پوچھتے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم بس یہی دو نشانیاں ارشاد فرماتے ہیں:

یعنی یہ کہ باندی اپنا آقا جن دے گی اور یہ کہ عرب کے ننگے پاؤں ننگے بدن مفلس چرواہے عمارتوں کی بلندی میں ایک دوسرے سے مقابلہ کر رہے ہوں گے۔ (مسلم، رقم 99)

'باندی اپنا آقا جن دے گی' غلامی کے خاتمے کی تمثیل ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ غلامی کے خاتمے کی قومی تحریکیں اور اقدامات اٹھارھویں اور انیسویں صدی عیسوی میں ایک ایک کر کے ہونے شروع ہوئے، یہاں تک کہ 1948ء میں انسانی حقوق کے آفاقی منشور کو اقوام متحدہ میں منظور کر لیا گیا، جس کے تحت عالمی سطح پر غلامی کو غیر قانونی قرار دے دیا گیا۔

اسی طرح عربوں کے مابین عمارتوں کی بلندی کا مقابلہ بھی چشمِ فلک پچھلی چند دہائیوں سے دیکھتی آ رہی ہے۔ کیسے برج خلیفہ کو باقاعدہ دنیا کی بلند ترین عمارت بنانے کے ارادے سے بنایا گیا۔ کیسے مکہ کے کلاک ٹاور کو بھی بلند ترین عمارتوں میں شامل کیا گیا، اور کیسے اب جدّہ ٹاور برج خلیفہ کا بھی ریکارڈ توڑنے جا رہا ہے۔ چنانچہ یہ دونوں نشانیاں پوری ہو چکیں۔

اگلی دس نشانیاں حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرما کر ایک ہی روایت میں اکٹھی بیان فرما دیں کہ قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہو گی، جب تک یہ دس نشانیاں پوری نہ ہو جائیں۔ ایک ایک کر کے ان کو سمجھتے ہیں۔

## زمین کا جانور (منگول حملہ)

'زمین کا جانور' اصل میں عربی الفاظ 'دابّۃ الارض' کا ترجمہ ہے۔ 'دابّۃ' کا مطلب جانور یا حیوان کے ہیں اور 'ارض' زمین کو کہتے ہیں۔

یہ دراصل بائیبل کی ایک اصطلاح ہے، جو ظالم بادشاہوں کے لیے ایک استعارہ ہے۔ چنانچہ جو بادشاہ اہل ایمان کے ساتھ بڑے پیمانے پر وحشیانہ سلوک کرتے ہیں، انھیں اس اصطلاح کے ذریعے سے جانوروں اور حیوانوں سے تشبیہ دے دی گئی ہے۔

مسلمانوں کے حق میں یہ منگول حملے کی طرف اشارہ تھا، جو تیرھویں صدی عیسوی میں پورا ہو چکا۔[1]

## سورج کا مغرب سے نکلنا 1500ء (مغربی اقوام کا عروج)

سورج کے مغرب سے نکلنے کی تمثیل کا اشارہ دنیا کی باگ ڈور مغربی اقوام کو منتقل ہو جانے کی طرف تھا، جو پندرھویں صدی عیسوی یا اس سے بھی کچھ پہلے سے شروع ہو کر اب تک جاری ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعض روایات[2] میں ان دونوں نشانیوں، یعنی زمین کا جانور اور سورج کے مغرب سے نکلنے کو یکے بعد دیگرے وقوع پذیر ہونے والے واقعات قرار دیا گیا ہے۔ یعنی یا تو سورج مغرب سے پہلے نکلنا تھا اور جانور بعد میں، اور یا جانور پہلے نکلنا تھا اور مغرب سے سورج بعد میں، مگر ایک کے پیچھے دوسرے کے نکلنے کی پیش گوئی تھی۔ چنانچہ اب ہم کہہ سکتے ہیں کہ جانور پہلے نکلا اور مغرب سے سورج بعد میں۔

اگلی دونوں نشانیاں بھی باہم متعلق ہیں، اس لیے انھیں اکٹھا ہی زیرِ بحث لاتے ہیں۔

## دجّال (19/20ویں، اشتراکیت) اور نزولِ عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام (19/20ویں، مسیحیت)

دجال، دراصل المسیح الدجال ہے۔ دجال عربی میں جھوٹے، فریبی اور دھوکے باز کے لیے

---

[1]۔ میں اس نشانی پر ایک مفصل ویڈیو بنا چکا ہوں، تفصیل کے خواہاں اسے دیکھ سکتے ہیں:
https://youtu.be/cnM5JIyz8fg

[2]۔ صحیح، رقم 144۔

استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ پوری اصطلاح کا مطلب ہے: جھوٹا مسیح۔ مسیح ویسے تو تاریخ یہود میں انبیا، بلکہ بادشاہوں کے لیے بھی عام لفظ تھا، مگر اسم معرفہ، یعنی المسیح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لیے خاص ہو گیا۔ تاہم، بعد میں محاور تاً یہ نجات دہندہ کے مفہوم کے لیے عام بھی ہو گیا۔ اس نشانی میں یہ اسی محاورے کے لیے استعمال ہوا ہے تو مطلب ہوا: جھوٹا نجات دہندہ، یعنی ایک ایسا شخص یا نظریہ جو دعویٰ تو انسانیت کے نجات دہندہ ہونے کا کرے گا، مگر دراصل وہ ہو گا انسانیت کے لیے سر تا سر ضرر اور ہلاکت۔

الغرض، دجال نظریۂ اشتراکیت، جسے انگریزی میں کمیونزم اور سوشلزم کہا جاتا ہے، کے لیے کنایہ ہے، جس سے پھر ریاستی سطح پر سائنسی الحاد یا 'scientific atheism' کی بنا پڑی۔

چنانچہ نمایاں ریاستیں جو اشتراکیت کی علم بردار بنیں، انھوں نے ریاستی مذہب سائنسی الحاد کو ہی قرار دیا۔ سو ویسے تو دجال ان تین اجزا، یعنی سائنس، الحاد اور اشتراکیت کا مرکب ہوا، تاہم ان میں سب سے نمایاں اور عنوان کی حیثیت اشتراکیت ہی کو حاصل ہے، جس نے ایک منظّم نظام فکر کی حیثیت سے بڑے بڑے دانش وروں کی مَت مار دی۔

پیش گوئی کے مطابق اسے شکست دینے کے لیے حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام کو نازل ہونا تھا، جو دراصل مسیحیت کی نشاۃ ثانیہ کے لیے تمثیل تھی۔ یعنی اس دجالِ اشتراکیت کا مقابلہ پھر مسیحیت نے مسلمانوں کے تعاون سے کیا، جس کے علم بردار کی حیثیت سے امریکہ نے تمام دنیا میں اس کا بیج مارنے کے لیے دہائیوں لمبی سرد اور گرم جنگ لڑی اور آخر کار بیسویں صدی کے اواخر میں اس دجال کو اس شان سے شکست ہوئی کہ ایک طرف دیوارِ برلن ٹوٹنے کا نظارہ ساری دنیا میں لائیو ٹیلی کاسٹ ہوا تو دوسری جانب اشتراکیت کا روحِ رواں، سوویت یونین، ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔

چنانچہ اس پوری کشمکش کو دجال اور عیسیٰ علیہ السلام کے لازوال کرداروں سے مجسم کرتے ہوئے ان کے درمیان جنگ سے تعبیر کیا گیا۔ چنانچہ یہ دونوں نشانیاں بھی بیسویں صدی کے اختتام سے پہلے پایۂ تکمیل کو پہنچ گئیں۔

## یاجوج وماجوج کا خروج (1500ء–1950ء مغربی نو آبادیاتی یلغار)

اگلی نشانی یاجوج وماجوج کا خروج ہے۔ یاجوج وماجوج اصلاً نوح علیہ السلام کے دو پوتوں کے نام

تھے، جو بائیبل کی تاریخ کے مطابق وسط ایشیا اور مشرقی و جنوبی یورپ میں آباد ہوئے۔ ان کا وہ اصل وصف جس کی بنیاد پر یہ تینوں ابراہیمی ادیان میں مذموم قرار پائے، وہ ان کی چھاپہ مار مہمات اور منظّم لوٹ مار پر مبنی ذریعۂ معاش تھا، جس کے تحت یہ اپنی ہم سایہ ریاستوں کے لیے ہمیشہ دردِ سر بنے رہتے۔

علم تاریخ میں اگرچہ ان کی بعد کی نسلوں کا پتا لگانا کوئی آسان کام نہیں، تاہم اس کی اب خاص ضرورت بھی نہیں رہی، کیونکہ اس نشانی میں یہ نسلی نام اپنے توسیعی مفہوم میں ان تمام یورپی ممالک کے لیے استعمال ہو گیا ہے جنھوں نے اسی وصفِ منظّم لوٹ مار کو پوری دنیا تک وسیع کر دیا۔

چنانچہ خروجِ یاجوج وماجوج سے مراد مغربی نو آبادیاتی یلغار (western colonization project) تھی، جو پندرھویں اور سولھویں صدی عیسوی سے شروع ہوا، جنگِ عظیم اوّل تک 84 فی صد دنیا پر قابض ہو گیا اور بیسویں صدی کے وسط کے کچھ ہی بعد اپنے اختتام کو پہنچ گیا۔ یہ نشانی اپنے اسی موقع و محل کی مناسبت سے احادیث میں نزولِ عیسیٰ علیہ السلام سے بھی مطابقت رکھتی ہے۔ چنانچہ یہ نشانی بھی بعینہٖ پوری ہو گئی۔

## زمین کا دھنسنا: مشرق، مغرب، عرب (1964ء، 1960ء، 2004ء، انڈونیشیا، چلی، الاسکا)

زمین کا دھنسنا عربی میں لفظِ 'خسف' سے ادا کیا گیا ہے، جو ذلت، نیچے ہو جانے، پھٹ یا دھنس جانے یا لینڈ سلائیڈنگ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ یہ دراصل اس پروسیس کا بیان ہے جس سے زلزلہ آتا ہے۔ خسف چونکہ زیرِ زمین بھی ہوتا ہے اور زیرِ آب بھی، جسے آج ہم 'سونامی' کے نام سے جانتے ہیں، لیکن چونکہ ماضی میں یہ امتیاز و اصطلاح ابھی وجود میں نہیں آئی تھی، اس لیے 'خسف' کے لفظ سے دونوں مفہوم مراد لے لیے گئے۔

چنانچہ مشرق میں یہ زمین کے دھنسنے کا تاریخ ساز واقعہ 26/ دسمبر 2004ء کو انڈونیشیا کے ایک جزیرے سماٹرا کے قریب بحر ہند میں 9.1 کی شدت سے پیش آیا، جس کا مشاہدہ ہم سب نے ٹی وی پر کیا، جو کم و بیش 14 ممالک میں 230،000 انسانوں کی ہلاکت کا باعث بنا۔

اسی طرح مغرب میں دنیا کی تاریخ کے دو بڑے زلزلے بالترتیب 9.5 اور 9.2 شدت کے حامل 1960ء اور 1964ء میں الاسکا اور چلی میں رونما ہوئے۔

عرب میں، البتہ اس نوعیت کا کوئی واقعہ میرے علم کی حد تک تاحال پیش نہیں آیا۔ چنانچہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان تین میں سے یہ ایک 'خسف' ابھی باقی ہے۔

## دھواں

اگلی نشانی عربی میں 'دخان'، یعنی دھواں ہے۔ چونکہ اس نشانی کے بارے میں کوئی اور تفصیل ہمیں احادیث یا کتبِ سماوی میں نہیں ملتی، اس لیے اس نشانی کے بارے میں گمان ہی قائم کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اکیسویں صدی کے آغاز سے اب تک یورپ، روس، آسٹریلیا، کینیڈا اور امریکہ وغیرہ، یعنی دنیا کے چاروں اطراف سے بڑھتی ہوئی جنگلاتی آگ کی جو تفصیلات و تصاویر ہر کچھ سال بعد میسر آتی رہتی ہیں، ذہن اسی طرف جاتا ہے کہ ان آگ کے بعد کئی کئی دن تک آسمان کا نارنجی و سرخ رہنا اسی نشانی کی تاویل ہے۔ اور سائنس دان اسی طرح اسے بیان بھی کر رہے ہیں کہ یہ بڑھتی ہوئی جنگلاتی آگ سے نکلنے والے دھویں کے ذرات کا ہوا میں معلق ہو جانے ہی کا نتیجہ ہے۔ لیکن کیا یہ نشانی پوری ہو چکی یا ابھی اسے کسی اور انتہا تک جانا ہے، اس کے بارے میں کوئی حتمی بات تو نہیں کہی جا سکتی، مگر محتاط اندازے کے مطابق یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہم اس نشانی کے آغاز و انتہا کے کہیں بیچ میں ہیں۔

## یمن سے ایک آگ کا نکلنا

آخری نشانی، جسے خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی آخری کہہ کر ارشاد فرمایا، یمن سے ایک آگ کے نکلنے کی پیش گوئی ہے۔ مختلف احادیث میں اس کی صورت یہ بیان کی گئی ہے کہ یہ آگ یمن میں عدن کے نچلے حصے سے نکلے گی، دن رات لوگوں کے قیام و آرام کی جگہوں میں ان کے ساتھ رہے گی اور انھیں ہانک کر ان کے محشر کی طرف لے جائے گی۔

یہ بھی ایک تمثیل ہی ہے اور اس طرح کی تماثیل سے عموماً کسی جنگ ہی کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ اور آگ کی جو کیفیت بیان کی گئی ہے، اس سے ایٹمی ہتھیاروں کے استعمال سے پیدا ہونے

والے تابکاری اثرات مراد لینے میں اب کوئی خاص رکاوٹ نہیں۔

تاہم، یہ نشانی چونکہ ابھی پوری نہیں ہوئی، اس لیے ابھی اس کے بارے میں ہمیں اپنا ذہن کھلا ہی رکھنا پڑے گا، کیونکہ تماثیل کی قسم کی پیش گوئیوں کی تاویلات تب ہی حتمیت کے درجے تک پہنچتی ہیں، جب وہ پوری ہو جاتی ہیں۔

آپ نے دیکھا۔ سوائے اس آخری نشانی کے، تقریباً سب ہی نشانیاں پوری ہو چکیں۔ اور بالکل ویسے ہی پوری ہوئیں، جیسے بتائی گئی تھیں۔ اس میں ہمارے رب اور پیغمبر کی مزید تصدیق کا عظیم سامان بھی ہے اور ہمارے لیے حکمتِ عملی کی تشکیل کے لیے اہم نشانِ منزل بھی۔ چنانچہ میں اپنے رب کا شکر ادا کرتا ہوں اور ان نشانیوں کے ضمن میں عجز سے کہتا ہوں کہ 'انا اوّل المؤمنین'۔

مجھے معلوم ہے کہ جس اختصار سے اس مقالے میں ان نشانیوں پر گفتگو کی گئی ہے، ان کے بہت سے زاویے ناظرین کو شاید تشنہ محسوس ہوں اور ان پر بہت سے سوالات بھی یقیناً ان کے ذہنوں میں پیدا ہوں گے، اس لیے اپنی ویڈیو سیریز "دریچہ" میں ایک ایک کر کے ان سب پر تفصیلی گفتگو جاری ہے۔ ناظرین سے التماس ہے کہ اگر ان کے کوئی خاص سوالات ہوں تو وہاں کمینٹس میں درج فرمائیں۔ میں ان شاء اللہ "دریچہ" کی متعلقہ قسط میں انھیں بھی شامل کرنے کی سعی کروں گا۔

نوٹ: اس عنوان پر میں ایک ویڈیو بھی بنا چکا ہوں، جس کا لنک یہ ہے:

https://youtu.be/YmUt_7wXz1s

https://www.patreon.com/adnanejazkhan

Yt: @aekhan.social (urdu)

@aekhan.english

ہم وہ مے کش ہیں کہ منت کشِ صہبا نہ ہوئے
مانگ لائے ہیں رگِ تاک سے نم اے ساقی

تحریر: علامہ شبیر احمد ازہر میرٹھی
ترتیب: ڈاکٹر محمد غطریف شہباز ندوی

# اِنْ جَآءَکُمْ فَاسِقٌ بِنَبَاٍ کی شانِ نزول کی تحقیق

## کیا ولید بن عقبہ فاسق تھے؟

(2)

[مختارات کا حصہ قدیم و جدید مصنفین کی منتخب تحریروں کے لیے مخصوص ہے۔ اس کا مقصد ماضی اور حال کے فکر و نظر کو قارئین کے سامنے پیش کرنا ہے۔ اس میں ماضی کے نمایندہ اہل علم کی تصانیف سے ایسے اقتباس نقل کیے جاتے ہیں، جو ان کے افکار اور اسالیب کو نمایاں کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ نئے لکھنے والوں کی موثر اور معتبر تحریروں کو بھی شامل کیا جاتا ہے۔ اِس حصے کے مندرجات سے مدیر اور ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ ادارہ]

اس اصولی بات کے بعد الگ الگ ایک ایک روایت پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں رہتی، لیکن اطمینان مزید کی خاطر میں ناظرین کے سامنے ایک ایک روایت پیش کیے دیتا ہوں۔

## مجاہد کی روایت:

ابنِ جریر نے اپنی سند کے ساتھ ابن ابی نجیح کی روایت نقل کی ہے۔

| | |
|---|---|
| عن مجاهد فی قوله تعالیٰ: 'اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌ' قال (هو) الولید بن عقبة ابن معیط بعثه النبی صلی الله علیه وسلم الی بنی المصطلق لیصدقهم فتلقوه بالهدیة فرجع الی محمد صلی الله علیه وسلم فقال ان بنی المصطلق جمعت لتقاتلك.[1] | ''یعنی ولید جب بنی مصطلق کے یہاں پہنچا تو وہ لوگ ہدیے تحفے لے کر اس کے استقبال کے لیے آئے اور ولید انھیں دیکھ کر مدینہ واپس ہو گیا اور رسول اللہ سے کہہ دیا کہ وہ لوگ آپ سے آمادۂ پیکار ہیں'' |

اس کی سند میں یہ کلام ہے کہ مجاہد نے یہ نہیں بتایا کہ اسے یہ قصہ کس شخص سے معلوم ہوا۔ اور متن میں یہ کہ یہ بات بالکل غیر معقول ہے کہ ولید ان کو دیکھ کر واپس ہو گیا، نیز مہمان کو ہدیہ و تحفہ واپسی کے وقت پیش کیا جاتا ہے، نہ کہ آمد کے وقت۔

## قتادہ کی روایت:

| | |
|---|---|
| قوله 'اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌ' هو ابن ابی معیط الولید بن عقبة بعثه نبی الله صلی الله علیه وسلم مصدقًا الی بنی المصطلق فلما ابصروه اَقْبلوا نحوه فهابَهم فرجع الی رسول الله صلی الله علیه | ''یعنی ولید بن عقبہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تحصیل زکوٰۃ کے لیے بنی مصطلق کے علاقہ میں بھیجا تھا۔ وہ لوگ اسے آتا دیکھ کر اس کی طرف بڑھے ولید ان سے ڈر گیا۔ واپس مدینہ جا کر آپ کو بتایا کہ وہ لوگ مرتد ہو گئے |

[1] ۔ تفسیر ابن جریر الطبری، سورۃ الحجرات، بتحقیق د، عبداللہ بن عبدالمحسن الترکی، مرکز البحوث للدراسات العربیہ والاسلامیہ بدار ھجر للنشر والتوزیع. (351/21)

وسلم فاخبرہ انھم قد ارتدوا عن الاسلام، فبعث نبی اللہ خالد بن الولید وامرہ ان یتثبت ولا یعجل. فانطلق حتی اتاھم فبعث عیونہ فلما جاء واخبروا خالدًا انھم مستمسکون بالاسلام وسمعوا اذانھم وصلاتھم. فلما اصبحوا اتاھم خالد فرأی الذی یُعجب. فرجع الی النبی فاخبرہ الخبر فانزل اللہ عزوجل ماتسمعون فکان نبی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول: التبین من اللہ والعجلۃ من الشیطان.

(تفسیر طبری 21/352)

ہیں۔ آپ نے خالد بن ولید کو بھیجا اور ہدایت فرمادی کہ جلد بازی سے کام نہ لینا، پہلے خوب تحقیق کر لینا۔ وہاں پہنچ کر خالد کو ان کے جاسوسوں نے رپورٹ دی کہ وہ دین پر جمے ہوئے ہیں۔ ہم نے ان کی اذان بھی سنی اور نماز بھی، صبح کو خالد خود ان کے پاس گئے اور بذاتِ خود ان کا دین پر دل خوش کن جماؤ دیکھا۔ مدینہ آکر آپ کو ماجرا سنایا تب یہ آیت اتری۔ اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ تحقیق کرنا اللہ کی جانب سے ہے اور جلد بازی شیطان کی جانب سے۔''

## عبد الرحمٰن بن ابی لیلیٰ کی روایت:

اِنْ جَآءَکُمْ فَاسِقٌ بِنَبَأٍالآیۃ... نزلت فی الولید بن عقبۃ حین اُرسل الی بنی المصطلق. (تفسیر طبری 21/352)

## یزید بن رومان کی روایت:

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارسل الی بنی المصطلق بعد اسلامھم الولید بن عقبۃ فلما سمعوا بہ رکبوا الیہ فلما سمع بھم خافھم فرجع الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاخبرہ ان القوم ھموا بقتلہ ومنعوا ما قِبَلَھم من صدقاتھم فاکثر المسلمون فی ذکر غزوتھم حتی تھیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بان یغزوھم،

فبینما هم فی ذلك اذ قدم وفدهم علی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فقالوا یارسول اللّٰہ انا سمعنا برسولك حین بعثت الینا فخرجنا الیہ لنکرمہ ولنؤدی الیہ ماقبلنا من الصدقة فاستمر راجعا فبلغنا انہ یزعم لرسول اللّٰہ انا خرجنا الیہ لنقتلہ واللّٰہ ما خرجنا لذلك، فانزل اللّٰہ فی الولید بن عقبة وفیهم یایها الذین اٰمنوا ان جائکم فاسق. (تفسیر طبری 21/352)[2]

قتادہ اور یزید بن رومان، دونوں کی روایتوں میں کھلا ہوا تضاد ہے۔ جیسا کہ ظاہر ہے مفسر نظام الدین نیشاپوری نے اپنی تفسیر میں یزید بن رومان کی اس روایت میں اضافہ بھی نقل کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وفد بنی المصطلق کی اس معذرت کا یقین نہیں کیا کہ یارسول اللہ، ہم تو آپ کے قاصد کا اکرام اور اسے مالِ زکوٰۃ ادا کرنے کی غرض سے نکلے تھے، مگر وہ رکا ہی نہیں واپس بھاگ آیا۔ آپ نے یہ سن کر ان سے فرمایا کہ تم لوگ اپنی سرکشی سے باز آجاؤ۔ ورنہ میں تمھاری سرکوبی کے لیے ایسے شخص کو بھیجوں گا جو میرے نزدیک میری مثل ہے، وہ تمھارے جنگی مردوں کو قتل اور تمھارے بچوں کو گرفتار کرے گا۔ یہ کہہ کر آپ نے علی بن ابی طالب کے کندھے پر ہاتھ مارا کہ وہ شخص یہ ہے: یہ سن کر وہ لوگ پکار اٹھے کہ ہم اللہ اور اس کے رسول کے غضب سے اللہ کی پناہ لیتے ہیں۔ 'فاتهمهم النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم وقال لتنتَهُنَّ اولا بعثن الیکم رجلا هو عندی کنفسی یقتل مقاتِلتکم ویسبی ذراریکم۔ ثم ضرب بیدہ علی کتف علی رضی اللّٰہ عنہ فقالوا نعوذ باللّٰہ من غضبہ وغضب رسولہ'۔[3]

اس روایت کا یہ جز پڑھ لینے کے بعد یہ حقیقت قطعاً بے نقاب ہو جاتی ہے کہ ولید کے متعلق یہ کہانی اور آیت 'اِنْ جَآءَکُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ' کا یہ شانِ نزول ایک خاص طبقہ کا گھڑا ہوا ہے۔ نہ معلوم مولانا مودودی نے اس جز کو کیوں قلم انداز کر دیا تھا۔

ان مرسل روایات کے علاوہ یہ قصہ حضرت ام سلمہ و حضرت عبد اللہ بن عباس اور حارث بن ضرار کی طرف منسوب کر کے بھی نقل کیا گیا ہے۔

---

[2]۔ اس کا مفہوم بھی مذکورہ بالا روایتوں سے ملتا جلتا ہے۔

[3]۔ تفسیر نیشاپوری علی ہامش تفسیر الطبری، سورۃ الحجرات۔

## حضرت ام سلمہ کی طرف منسوب روایت:

ابن جریر طبری نے لکھا ہے:

حدثنا ابوکریب ثنا جعفر بن عون عن موسی بن عبیدۃ عن ثابت مولیٰ ام سلمۃ عن ام سلمۃ قالت بعث رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم رجلا فی صدقات بنی المصطلق بعد الوقعۃ فسمع بذلك القوم فتلقوہ یعظمون امر رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فحدثہ الشیطن انھم یریدون قتلہ فرجع الی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فقال ان بنی المصطلق قد منعوا صدقاتھم فغضب رسول اللہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم والمسلمون فبلغ القوم رجوعُہ فاتوا رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فصفوا لہ حین صلی الظھر فقالوا نعوذ باللّٰہ من سخط اللّٰہ وسخط رسولہ بعثت الینا رجلا مصدقا فسُرِرنا بذلك وقرت بہ اعینُنا ثم انہ رجع من بعض الطریق فخشینا ان یکون ذلك غضبا من اللّٰہ ومن رسولہ فلم یزالوا یکلمونہ حتی جاء بلال واذن لصلوۃ العصر ونزلت یا ایھا الذین امنو ان جاءکم فاسق. (تفسیر طبری 21/349)

”ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ بنی مصطلق کے بعد اس قبیلہ سے اموالِ زکوٰۃ وصول کرنے کے لیے ایک شخص کو بھیجا۔ بنی مصطلق کے لوگوں نے اس کے آنے کی خبر سنی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی عظمت ملحوظ رکھتے ہوئے اس کا استقبال کیا۔ اب اس شخص کے دل میں شیطان نے یہ خیال ڈال دیا کہ یہ لوگ مجھے قتل کر دینا چاہتے ہیں۔ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف مدینہ واپس ہو گیا۔ آکر بتایا کہ بنی مصطلق نے زکوٰۃ روک لی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو یہ سن کر غصہ آیا۔ اُدھر بنی مصطلق کو اس شخص کے واپس چلے جانے کی اطلاع ہوئی تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نمازِ ظہر پڑھ چکے تو وہ آپ کے سامنے صف بستہ ہو گئے۔ عرض کیا: ہم اللہ کی پناہ لیتے ہیں اللہ کی ناراضی سے اور اس کے رسول کی ناراضی سے۔ آپ نے

ہمارے پاس ایک صدقہ وصول کرنے
والا آدمی بھیجا تھا ہمیں اس سے خوشی
ہوئی اور ہماری آنکھیں ٹھنڈی ہوئیں پھر
وہ راستہ سے ہی واپس ہو گیا۔ ہمیں خوف
ہوا کہ یہ اللہ اور اس کے رسول کی
ناراضی کی وجہ سے ہوا ہے پس وہ نمازِ
عصر کی اذان تک آپ سے بات کرتے
رہے اور یہ آیت نازل ہوئی۔''

اس کی اسناد میں دو علت ہیں: اول یہ کہ اس کا راوی موسیٰ بن عبیدہ نہایت ضعیف ہے۔ غلو کار شخص تھا، نسائی و علی بن المدینی و ابن معین وغیرہم نے اسے ضعیف بتایا ہے۔

امام احمد کہتے ہیں: 'لاتحل الروایۃ عندی عنہ'، (میرے نزدیک اس سے روایت کرنا جائز نہیں)۔ ایک بار کہا: 'لایکتب حدیثہ' (اس کی حدیث نہیں لکھی جانی چاہیے)۔ 'وقال البخاری قال احمد: منکر الحدیث، حدث باحادیث منکرۃ'، (اس نے بہت سی منکر حدیثیں روایت کی ہیں)۔[4] دوم یہ کہ ثابت مولائے ام سلمہ ایک فرضی شخص ہے۔ حضرت ام سلمہ کا کوئی غلام اس نام کا نہ تھا۔ کتب رجال اس ثابت کے ثبوت سے ساکت ہیں۔

اسناد کے اس ضعف کے باوجود اگر مان بھی لیا جائے کہ فی الواقع حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے یہ قصہ بیان کیا تھا تب بھی یہ ولید بن عقبہ کا قصہ نہیں ہو سکتا۔ نہ اس روایت میں ولید کا نام مذکور ہے نہ ولید عہد نبوی میں اس لائق ہوئے تھے کہ انھیں کہیں مصدق بنا کر بھیجا جاتا۔ ولید فتح مکہ کے موقع پر نابالغ بچہ تھے اور فتح مکہ کے بعد ہی وہ اپنے گھر کے لوگوں کے ساتھ مدینہ منتقل ہوئے۔ فتح مکہ 8ھ میں ہوئی ہے اور حضرت ام سلمہ کی طرف منسوب یہ واقعہ اگر ہوا ہے تو 7ھ میں ہوا ہے۔ اس لیے ولید سے اس واقعہ کا کوئی تعلق نہیں۔

[باقی]

---

[4]۔ تہذیب التہذیب، الجلد العاشر، دار الفکر، بیروت، الطبعۃ الاولی، 1984ء۔

ثاقب علی

# پاکستانی معاشرتی رویے

## برداشت، اختلاف اور انتہا پسندی

پاکستانی معاشرہ تاریخی، ثقافتی اور مذہبی بنیادوں پر تشکیل پایا ہے، جس میں پولیس، فوج اور مذہبی طبقے کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ یہ ادارے عوام کی زندگی کے اہم پہلوؤں کی نمایندگی کرتے ہیں، لیکن ان کے ساتھ اختلاف کی صورت میں جو رویے سامنے آتے ہیں، وہ ہمارے معاشرے میں برداشت کی کمی اور انتہا پسندی کے بڑھتے ہوئے رجحان کو واضح کرتے ہیں۔ یہ مضمون انسانی نفسیات، تاریخی مثالوں اور موجودہ حقائق کی روشنی میں ان رویوں کا جائزہ لیتا اور ان کے معاشرتی اثرات کو بیان کرتا ہے۔

پاکستانی معاشرے میں پولیس کا کردار عوامی تحفظ اور قانون کا نفاذ ہے، لیکن بدعنوانی اور نااہلی کے الزامات اس ادارے کی ساکھ کو نقصان پہنچا چکے ہیں۔ جب کوئی فرد پولیس سے اختلاف کرتا ہے یا اس کے رویے پر سوال اٹھاتا ہے تو عمومی طور پر نتائج رشوت، دھمکی یا قانونی مسائل کی صورت میں سامنے آتے ہیں۔ پولیس کے ادارے میں ایک غیر منظم اور محدود طاقت کے استعمال کی وجہ سے عوام کو جسمانی خطرے کا سامنا کم ہوتا ہے۔ یہ رویہ اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ قانون کے نفاذ کے لیے موجود اس ادارے میں اصلاحات کی اشد ضرورت ہے تاکہ عوامی اعتماد بحال ہو سکے۔

فوج کا کردار نہ صرف ملکی دفاع، بلکہ سیاسی اور معاشی میدان میں بھی بہت زیادہ اہم ہے۔ پاکستانی فوج کو عوام کے دلوں میں احترام اور خوف، دونوں حاصل ہیں، جو اکثر سماجی استحکام میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ تاہم، فوج کے ساتھ اختلاف یا اس پر تنقید ایک حساس معاملہ ہے۔ اس کے نتائج میں دباؤ ڈالنا، نظر بندی یا بعض اوقات نوکری سے برطرفی شامل ہو سکتی ہے، لیکن انسانی زندگی کو فوری خطرہ لاحق ہونے کے امکانات کم ہی ہوتے ہیں، کیونکہ فوج کے اندر ایک منظم ڈھانچہ اور ضابطے موجود ہیں، جو طاقت کے بے جا استعمال کو محدود کرتے ہیں۔

مذہبی طبقے سے اختلاف کی صورت میں صورت حال بالکل مختلف اور خطرناک رخ اختیار کر لیتی ہے۔ مذہبی رہنما عوام کے روحانی رہنما ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بڑی سماجی طاقت بھی رکھتے ہیں۔ اگر ان کے نظریات کو تسلیم کیا جائے تو وہ جنت کی بشارتیں دیتے ہیں اور دعاؤں میں برکت کی یقین دہانی کراتے ہیں، لیکن جیسے ہی کوئی ان کے نظریات پر سوال اٹھائے یا ان سے اختلاف کرے تو وہ شخص کافر، گستاخ یا دشمن اسلام قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد عوامی جذبات کو بھڑکایا جاتا ہے، جو اکثر تشدد اور انتہا پسندی کا باعث بنتے ہیں۔ حالیہ برسوں میں ایسے کئی واقعات سامنے آئے ہیں، جہاں مذہبی اختلافات نے جان لیوا صورت حال پیدا کی ہے۔ یہ رویہ اس بات کی عکاسی کرتا ہے کہ ہمارے معاشرے میں اختلاف کو دبانے کے لیے مذہب کو ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے۔

ان رویوں کی جڑیں معاشرتی اور تعلیمی نظام میں پیوست ہیں۔ ہمارا تعلیمی نظام تنقیدی سوچ کو فروغ دینے کے بجائے اندھی تقلید کی حمایت کرتا ہے۔ مدارس اور دیگر تعلیمی ادارے طلبہ کو سوال کرنے کے بجائے صرف روایتی علم کی پیروی سکھاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نئی نسل اختلاف کو دشمنی یا گستاخی کے طور پر دیکھتی ہے۔ انسانی نفسیات کے مطابق، جب کسی معاشرے میں خوف کا غلبہ ہو تو وہ معاشرہ فکری جمود کا شکار ہو جاتا ہے اور اس میں ترقی کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے۔

تاریخ ہمیں سکھاتی ہے کہ وہ اقوام جو اختلاف کو دبانے کے بجائے مکالمے کو فروغ دیتی ہیں، وہی ترقی کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر یورپ نے قرونِ وسطیٰ کے دورِ جمود سے نکل کر روشن خیالی کا راستہ اس وقت اپنایا جب مکالمے کی آزادی دی گئی۔ دوسری جانب، انکوائزیشن کے دوران میں

کلیسا کی جانب سے اختلاف کو دبانے کی روش نے یورپ کو صدیوں تک تاریکی میں رکھا۔ اسی طرح، اسلامی تاریخ کے ابتدائی دور میں اختلافِ رائے کو برداشت کیا جاتا تھا اور علمی ترقی اپنے عروج پر تھی، لیکن جب رواداری ختم ہوئی اور اختلاف کو دبایا گیا تو امت مسلمہ زوال کا شکار ہو گئی۔

پاکستانی معاشرہ اس وقت اسی طرح کے دوراہے پر کھڑا ہے۔ ہمارے یہاں برداشت کی کمی اور انتہا پسندی نہ صرف معاشرتی امن کو خطرے میں ڈال رہی ہے، بلکہ فکری ترقی کی راہیں بھی بند کر رہی ہے۔ اگر ہم اپنے معاشرے کو اس دلدل سے نکالنا چاہتے ہیں تو ہمیں برداشت، مکالمے اور رواداری کو فروغ دینا ہو گا۔

ریاست کو چاہیے کہ وہ ایسے قوانین نافذ کرے جو اختلاف کو دبانے کے بجائے اسے سماجی ترقی کے ایک عنصر کے طور پر تسلیم کریں۔ تعلیمی نظام کو اس طرح سے ڈھالنا ہو گا کہ طلبہ میں تنقیدی سوچ اور اختلافِ رائے کو برداشت کرنے کی صلاحیت پیدا ہو۔ عوام کو بھی یہ سمجھنا ہو گا کہ اختلاف دشمنی نہیں، بلکہ ایک مہذب مکالمے کا آغاز ہے۔

اختلاف رائے کسی بھی مہذب اور ترقی یافتہ معاشرے کی بنیاد ہے۔ ہمیں اپنی اجتماعی سوچ کو تبدیل کرنے اور برداشت کو فروغ دینے کی ضرورت ہے تاکہ ہم ایک پرامن اور ترقی یافتہ معاشرہ بنا سکیں۔ تاریخ ہمیں یہ سکھاتی ہے کہ وہ اقوام جو اختلاف کو ایک نعمت کے طور پر اپناتی ہیں، وہی اپنے مستقبل کو روشن بناتی ہیں۔ یہی سبق ہمارے لیے بھی ضروری ہے۔

ڈاکٹر عمار خان ناصر / ڈاکٹر سید مطیع الرحمن

# مطالعۂ سنن ابن ماجہ

(سنن ابن ماجہ کی احادیث سے متعلق استفسارات اور ان کا جواب)

(1)

مطیع سید: سنن ابن ماجہ کو عام طور پر صحاح ستہ میں چھٹے درجے میں گنا جاتا ہے۔ امام بخاری کا معیار سب سے مضبوط اور سخت ہے۔ یہ لوگ امام بخاری کے بعد کے ہیں تو معیار اس سے آگے بڑھنا چاہیے تھا یا کم ہونا چاہیے تھا؟ یا ایسا ہے کہ انھوں نے دیکھا کہ حدیث کے معیار میں زیادہ سختی ہو رہی ہے، تو کچھ نرمی ہونی چاہیے؟

عمار ناصر: یہ اچھا اور اہم سوال ہے کہ جو صحاح کے مصنفین ہیں، کیا وہ ایک دوسرے کے معیارات کو سامنے رکھ کر اور ایک دوسرے کے موازنے میں کوئی کام کر رہے ہیں؟ مجموعی طور پر تو ایسا نہیں ہے۔ یہ تاثر اصل میں اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ جو بہت سے مجموعے اس دور میں مرتب کیے گئے، ان میں سے ان پانچ یا چھ کو زیادہ قبولیت محدثین میں حاصل ہو گئی، اور یہ بات بھی دکھائی دیتی ہے کہ ان کے معیارات میں فرق ہے تو آج جب ہم دیکھتے ہیں تو یہ تاثر پیدا ہو سکتا ہے کہ شاید یہ ایک دوسرے کے تقابل میں کوئی کام کر رہے تھے۔ ایسا نہیں ہے۔ البتہ امام بخاری اور امام مسلم کی حد تک یہ کہا جا سکتا ہے، کیونکہ امام مسلم کو امام بخاری کے بعض شرائط پر تحفظات

تھے اور انھوں نے اپنی صحیح میں اس کو سامنے رکھا ہے کہ میں نے اتنی سختی نہیں برتی، بلکہ میرے نزدیک راویوں کی باہمی ملاقات کے ثبوت کے جو اصول ہیں، ان کے مطابق جو روایتیں ہیں، وہ میں لے آؤں گا۔ تو امام مسلم کی حد تک تو یہ پہلو درست ہے کہ وہ امام بخاری کی شرط کو زیادہ سخت سمجھتے ہوئے اس کے تقابل میں اپنی صحیح مرتب کر رہے ہیں۔

باقی جو سنن کے مصنفین ہیں، وہ سب اپنے اپنے طور پر کام کر رہے تھے۔ اس دور میں یہ حضرات ایک دوسرے کے کام سے بہت زیادہ واقف یا متعارف ہوں، یہ کہنا بھی مشکل ہے۔ وہ آزادانہ تحقیق سے اپنے اپنے مجموعے مرتب کر رہے تھے۔ ان کے علاوہ اور بھی لوگ تھے جو یہ کام کر رہے تھے۔ ہاں، ان کی مجموعی صحت کو سامنے رکھتے ہوئے جب ان کا انتخاب کر لیا گیا تو پھر ان میں درجہ بندی کی گئی اور اس میں یہ طے پایا گیا کہ فلاں کتاب کا معیار فلاں کے مقابلے میں زیادہ کڑا ہے۔ یہ مصنفین کے پیشِ نظر شاید نہیں تھا کہ میں فلاں محدث کی شرط سے مزید نرم یا سخت شرط اختیار کروں۔ ان کا اپنا جو بھی ذوق تھا، جو معیار تھا، اس پر انھوں نے روایات جمع کر لیں۔ البتہ اب ہم دیکھتے ہیں کہ امر واقع کے طور پر ان میں درجہ بندی کا فرق موجود ہے۔

مطیع سید: امام مسلم، امام بخاری کے براہِ راست شاگرد تھے، اس لیے انھوں نے ان کے کام کو سامنے رکھا؟

عمار ناصر: امام مسلم بھی امام بخاری کے شاگرد تھے اور امام ترمذی بھی امام بخاری کے شاگرد تھے، لیکن امام ترمذی نے اصطلاحات بھی اپنی وضع کیں، اور شرائط بھی اپنے وضع کیے اور ان کی کتاب کا جو بنیادی مقصد ہے، وہ بھی مختلف تھا۔

مطیع سید: ''باب اتباعِ سنۃ الرسول'' میں امام ابن ماجہ یہ روایت لائے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت میں ایک گروہ ہو گا جو غالب رہے گا، اور دین پر قائم رہے گا۔[1] ہمارے ہاں ہر گروہ اور ہر فرقہ اپنے آپ کو اس گروہ کا مصداق قرار دیتا ہے۔ آپ کے نزدیک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کا اصل مقصد کیا تھا؟

عمار ناصر: یہ اصل سوال ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم یہ بات کس پہلو سے بتا رہے ہیں؟ اگر تو

---

[1] ۔ ابواب السنۃ، باب اتباعِ سنت رسول اللہ، رقم 7-6۔

اس پہلو سے بتا رہے ہیں کہ بعد میں جو آنے والے ہیں، ان تک یہ بات پہنچے اور وہ اس ایک گروہ کے ساتھ وابستہ رہیں تو پھر تو یہ بڑا اہم سوال بنتا ہے کہ پہلے اس کے مصداق کا پتا ہونا چاہیے۔ ورنہ لوگ کیسے فیصلہ کریں کہ ان سارے گروہوں میں سے وہ گروہ کون سا ہے؟ اصل میں یہ بات ارشاد فرمانے کا بنیادی مقصد یہ نہیں تھا۔ بنیادی مقصود اس بات کا سننے والوں کو بتانا یہ تھا کہ جو دین میں نے دیا ہے، کچھ عرصے میں اس میں خلل واقع ہونا شروع ہو جائے گا، اور اس کی جو معیاری صورت ہے، اس پر سارے لوگ قائم نہیں رہ سکیں گے۔ البتہ اللہ تعالیٰ اس کا بندوبست کرے گا کہ ایک گروہ بہ ہر حال اس پر قائم رہے، چاہے وہ تعداد میں کم ہو اور کم زور ہو۔ اس سے فرق نہیں پڑتا، لیکن بہ ہر حال وہ موجود رہے گا۔ رہا یہ مسئلہ کہ اختلاف اور فتنوں کے دور میں لوگ کیسے صحیح دین کو پہچانیں تو وہ ایک الگ سوال ہے۔ اس کے مختلف پہلو دیگر احادیث میں بیان ہوئے ہیں۔

مطیع سید: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک شخص تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھا ہو گا، اور کہے گا کہ ہمارے لیے قرآن ہی کافی ہے، حدیث کی ضرورت نہیں۔[2] آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کے ہاں تو ایسا بہ ظاہر محسوس نہیں ہوتا کہ وہ ایسا کوئی رویہ اپنائیں گے تو کیا آپ اس بات کو محض پیشین گوئی کے طور پر بیان فرما رہے ہیں یا آپ نے ایسے کوئی رویے محسوس فرمائے؟

عمار ناصر: پیشین گوئی کے طور پر بیان فرما رہے ہیں اور اس طرح کے جو فتنے ہیں، وہ عملاً تو بعد میں رونما ہوئے، لیکن ان کے آثار ظاہری طور پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دور میں محسوس کر رہے تھے۔ جیسے خوارج ایک منظم فتنے کے طور پر تو بعد میں سامنے آئے، لیکن ان کا جو دینی رویہ تھا، وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دور کے ایک شخص کی مثال دے کر واضح فرمایا کہ اسی کی قبیل سے لوگ آئیں گے۔ تو ابتدائی آثار و علامات تو ظاہر ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نظر آ رہی تھیں۔ بعد میں پھر اپنے اپنے وقت پر یہ رویے منظم شکل میں سامنے آئے۔

مطیع سید: ابن کعب فرماتے ہیں کہ حضرت عمر نے انھیں کوفہ کا عامل بنا کر بھیجا تو راستے میں دور تک ساتھ چلتے ہوئے وصیت کی کہ لوگ تم سے بڑے اشتیاق سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی

---

[2] ۔ ابواب السنۃ، باب تعظیم حدیث رسول اللہ والتغلیظ علی من عارضہ، رقم 12۔

احادیث پوچھیں گے، لیکن تم بہت کم روایتیں بیان کرنا۔[3] لوگوں میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے بارے میں اشتیاق ہونا، یہ تو کوئی بری بات نہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح احادیث بیان کرنا بھی بہت اچھا عمل ہے تو پھر حضرت عمر کی اس بات کا پس منظر کیا تھا؟

عمار ناصر: زیادہ تر اکابر صحابہ تقلیل الروایۃ کے قائل تھے۔ تکثیر الروایۃ کے قائل تو چند ایک ہی تھے، جیسے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ یا عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ۔ اس سلسلے میں ان کے جو بنیادی خدشات تھے، وہ دو تین تھے جنھیں وہ اپنی روایتوں میں بیان بھی کرتے ہیں۔ سب سے بڑا خدشہ تو وہی تھا جو خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی تھا کہ امت کی توجہ سب سے زیادہ قرآن پر مرکوز رہنی چاہیے۔ اگر احادیث بھی اس توجہ کو بٹانے کا موجب بنیں تو یہ ٹھیک نہیں ہے، اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خاص وقت تک لوگوں کو احادیث لکھنے سے منع بھی کیا۔ حضرت عمر کی بھی یہ ترجیح تھی کہ قرآن پر لوگوں کی توجہ مرکوز رہے۔ اگر لوگوں کی توجہ اس طرف ہو جائے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں بھی جمع کرنی ہیں تو قرآن کو جو اعتنا ملنا چاہیے، جو توجہ ملنی چاہیے، وہ کم ہو جائے گی یا بٹ جائے گی۔

دوسری یہ بات تھی کہ قرآن تو بڑی حفاظت کے ساتھ باللفظ نقل ہو رہا تھا، اس میں کمی بیشی کی گنجایش نہیں، لیکن حدیثوں کے راستے سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جھوٹ منسوب کرنے کا راستہ بھی کھل جائے گا اور کثرت روایت سے غلطی کا امکان بھی بڑھتا جائے گا۔ یہ نقصان اس فائدے سے زیادہ بڑا ہو گا، جو ظاہراً ان کو بیان کرنے سے ہو گا۔ ظاہر ہے کہ صحابہ جن مختلف علاقوں میں جائیں گے، اور ان سے جو لوگ حدیثیں پوچھ رہے ہوں گے، ان سب کا بیک گراونڈ مختلف ہو گا، اور ان میں کچھ فتنہ پرداز لوگ بھی ہو سکتے ہیں۔ تو حضرت عمر کا خدشہ یہ تھا کہ حدیث کو جتنا کثرت سے روایت کرنے کا معمول بنتا چلا جائے گا، اتنا ہی لوگوں کے لیے جھوٹ شامل کرنا آسان ہو جائے گا۔

تیسری بڑی بات یہ تھی جس کا ذکر بعض صحابہ کے آثار میں، مثلاً حضرت علی کے آثار میں آتا ہے کہ بہ ہر حال نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی باتوں میں بعض دفعہ بہت ہی لطیف بات ہوتی ہے،

---

[3] ۔ ابواب السنۃ، باب: التوقی فی الحدیث عن رسول اللہ، رقم 28۔

جس کو سمجھنا اہلِ علم کا کام ہوتا ہے۔ خاص طور پر اگر اس بات کا کوئی پس منظر ہو گا تو اس سے ناواقف شخص غلط فہمی کا بھی شکار ہو سکتا ہے۔ تو اس کا بھی خدشہ صحابہ محسوس کر رہے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح باتیں بھی نئے لوگوں کے لیے، یا کم فہم لوگوں کے لیے قابلِ فہم نہ ہوں اور وہ ان سے اپنے لیے دین میں کوئی فتنے پیدا کر لیں۔ تو یہ دو تین بڑی واضح وجوہات تھیں۔

مطیع سید: بعد میں بالکل یہی مسائل پیش آئے جس کی وجہ سے پھر حدیث کی تحقیق کی طرف محدثین کو متوجہ ہونا پڑا۔

عمار ناصر: جی، اسی لیے پھر امت کو بہت محنت کرنی پڑی، دو تین صدیاں اس علم کی خدمت میں لگانی پڑیں۔

مطیع سید: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تجھے ناپسندیدہ چیز کا سامنا کرنا پڑے تو ایسا نہ کہو کہ اگر میں ایسا کرتا یا ویسا کرتا تو شاید یہ نہ ہوتا، بلکہ یوں کہو کہ یہ اللہ کی طرف سے تقدیر تھی اور ویسا ہی ہوا، اس لیے کہ اگر مگر تجھ پر شیطان کا دروازہ کھولتا ہے،[4] لیکن اگر ہم اپنی زندگی کے ہر واقعے کو ایسے دیکھنا شروع کر دیں تو پھر خود تنقیدی اور خود احتسابی نہیں پیدا ہو سکتی۔ آپ اپنے ماضی پر تنقید کیے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتے۔ یہ رویہ یک طرفہ سا معلوم ہوتا ہے۔

عمار ناصر: یہاں دو الگ الگ چیزیں ہیں: ایک یہ ہے کہ آپ نے کوئی فیصلہ کیا اور تدبیر کے پہلو سے کوئی غلطی کی تو اس سے سبق سیکھنے کے لیے آپ یہ جائزہ لیں کہ اگر میں یوں کرتا یا ایسے کر لیتا تو شاید اس کا نتیجہ مختلف ہوتا۔ یہ اور بات ہے، اس سے حدیث میں منع نہیں کیا گیا۔ جس بات سے حدیث میں منع کیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ ایک کام جو خلاف منشا ہو گیا ہے، اس کو آپ دل پر لے کر بیٹھ جائیں اور افسوس کرتے رہیں کہ کاش، یوں کر لیتا یا ایسے کر لیتا۔ یہ جو کسی بات کو دل پر لے کر بیٹھ جانا ہے، یہ آپ کی شخصیت کو بھی تباہ کر دیتا ہے اور شیطان کی وسوسہ اندازی کا دروازہ بھی یہیں سے کھل جاتا ہے۔ وہ آپ کے دل میں اللہ کے بارے میں شکایت، وسوسے اور اس طرح کی ساری چیزیں یہیں سے پیدا کرتا ہے۔ اس سے حدیث میں منع کیا گیا ہے۔

مطیع سید: خوارج کے بارے میں جو متعدد احادیث آتی ہیں، ان میں یہاں تک الفاظ آتے ہیں

---

[4] ۔ ابواب السنۃ، باب فی القدر، رقم 79۔

کہ انھیں دیکھو، ان سے ملو تو انھیں قتل کر دو،[5] لیکن حضرت علی نے فرمایا کہ جب تک یہ ہتھیار نہیں اٹھائیں گے، تب تک ہم انھیں قتل نہیں کریں گے۔ احادیث میں تو الفاظ یہ ہیں کہ جہاں کہیں ملیں، انھیں قتل کر ڈالو۔ احادیث میں تو ایسا نہیں آیا کہ جب تک ہتھیار نہ اٹھالیں، تب تک تم ان سے باز رہنا۔

عمار ناصر: نہیں، ان الفاظ کا مقصد یہ نہیں ہے کہ وہ اگر کوئی فتنہ نہ برپا کر رہے ہوں، تب بھی انھیں قتل کر دیا جائے۔ مقصد یہ ہے کہ ان سے قتال کرنے میں یا ان کو ایک فتنہ سمجھنے میں کوئی مداہنت نہیں ہونی چاہیے، لیکن تب جب وہ برسرِ پیکار ہوں اور شر پھیلانے پر آمادہ ہوں۔ یہ تاکید کا اسلوب ہے، جیسے قرآن میں ہے: ’فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ‘، یعنی ان کے بارے میں نرمی کا کوئی پہلو نہیں ہونا چاہیے۔ یہ مراد نہیں ہے کہ انھیں جہاں بھی دیکھیں، تحقیق کی کوئی ضرورت محسوس نہ کریں یا کوئی دوسرا آپشن استعمال نہ کریں، یہ مقصد نہیں ہے۔ یہاں بھی ایسے ہی ہے کہ ان کے بارے میں بالکل یکسو ہو کر اقدام کرو اور اگر وہ فساد پر مصر ہیں تو تمھاری طرف سے بھی عزم میں کوئی کمی نہیں ہونی چاہیے۔

مطیع سید: نبی صلی اللہ علیہ وسلم سات آسمان اور ان کے درمیان فاصلہ بیان فرما رہے ہیں۔ آٹھ پہاڑی بکرے ہیں جنھوں نے عرش اٹھا رکھا ہے اور ان کے گھٹنوں اور کھروں کے درمیان فاصلہ بیان فرما رہے ہیں۔ پھر ایک آسمان کا دوسرے آسمان تک کا فاصلہ بیان فرما رہے ہیں۔[6] قرآنِ حکیم کا انداز تو یہ ہے کہ وہ ایسی آیات کو متشابہات کی صورت میں بیان کرتا ہے اور اس طرح کی باتوں کی کرید میں پڑنے کو پسند بھی نہیں کرتا۔ ایک اجمالی سی بات کر کے آگے بڑھ جاتا ہے۔ پھر احادیث میں ان چیزوں کی اتنی تفصیل کیوں بیان کی جا رہی ہے؟

عمار ناصر: متشابہات جن کی کرید میں جانا یا کھوج کرنا ناپسندیدہ ہے، وہ تو اس شرط کے ساتھ ہے کہ اس نوعیت کی جو بات اللہ تعالیٰ نے جتنی بیان کی ہے، وہ اگر اجمالاً ہی قابلِ فہم ہے تو اس کی کرید میں نہ پڑا جائے۔ اس کی کرید میں نہ پڑنے کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اس کے

---

[5] ۔ ابواب السنۃ، باب فی ذکر الخوارج، رقم 168۔

[6] ۔ ابواب السنۃ، باب فیما انکرت الجہمیۃ، رقم 193۔

اجمال کو کھولے یا کھولنے کی کوشش کرے تو وہ اس کے بس کی بات نہیں ہے۔ وہ خواہ مخواہ خیالی گھوڑے دوڑائے گا۔ اگر اللہ تعالیٰ خود یا اس کا پیغمبر اس کی کچھ تفصیلات انسانوں کے اطمینان کے لیے، جس سے ان کے ذہن میں اللہ کے عرش کی یا اس کے دربار یا اس کی بارگاہ کی ایک ذہنی تصویر سی بن جائے، بیان کرے یہ تو اس کے خلاف نہیں ہے۔

مطیع سید: روایت میں آیا ہے کہ پانچ چیزیں فطرت میں سے ہیں۔ ان میں ایک ختنہ کرانا بھی ہے۔[7] یہاں فطرت کن معنوں میں بیان ہوا ہے؟ ختنہ تو غالباً حضرت ابراہیم علیہ السلام سے شروع ہوا ہے۔ اگر یہ فطرت میں شامل ہے تو یہ تو روزِ اول سے ہونا چاہیے تھا۔

عمار ناصر: فطرت سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لیے صفائی ستھرائی اور جسمانی طہارت و نظافت کو پسند کیا ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ طریقہ ہے جس پر انسان کو ہونا چاہیے، وہ فطرت ہے۔ یہ درست قیاس ہے کہ یہ فطری طریقے ابتدا سے ہی انسانوں کو سکھائے گئے ہوں گے، مثلاً دانت اور ناک صاف کرنے اور جسم کے زائد بال صاف کرنے کی ہدایت شروع سے ہی ہو گی، البتہ ختنے کو شاید تغلیباً یہاں امور فطرت کے ذیل میں شمار کیا گیا ہے۔ ایک لحاظ سے اس کی بھی مناسبت جسمانی صفائی سے بنتی ہے، لیکن یہ اصل میں ایک خاص علامتی رسم ہے، جو حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی ذریت کے لیے مقرر کی گئی۔

یہ بھی ممکن ہے کہ ابتدا سے انبیا کے ذریعے سے انسانوں کو یہ طریقہ بتایا تو گیا ہو، لیکن پھر ان میں متروک ہو گیا ہو اور حضرت ابراہیم نے پھر آ کر اس کی تجدید کی ہو، یعنی وہ معلوم تاریخ کے اعتبار سے پہلے نبی ہوں جنھوں نے اس رسم کو جاری کیا۔ اگر یہ فرض کیا جائے تو پھر اس کو بھی فطرت میں شمار کرنا قابل فہم ہے۔ ہاں، ساری دنیا کے انسان اسی پسندیدہ فطرت کے مطابق ڈھلے ہوئے ہوں، یہ ایک الگ بحث ہے۔ جیسے شرک ہے تو اللہ تعالیٰ نے تو انسان کو شرک پر پیدا نہیں کیا، توحید پر پیدا کیا ہے، لیکن ساری دنیا شرک میں مبتلا رہی ہے۔ پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی اولاد پر اللہ تعالیٰ نے خصوصی کرم فرمایا اور اس کو نعمت کے طور پر بیان کیا کہ دنیا کی باقی قومیں گم راہی میں بھٹک رہی ہیں، اور تمھارے لیے میں نے ہدایت کا اہتمام کیا ہے۔

---

[7] ۔ کتاب الطہارۃ و سننھا، باب الفطرۃ، رقم 292۔

مطیع سید: حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ لوگ وضو میں پاؤں دھوتے ہیں، جب کہ میں کتاب اللہ میں تو مسح ہی پاتا ہوں۔[8] کیا یہ موقف صرف ابن عباس کا ہے یا اور بھی صحابہ اس میں شامل ہیں؟

عمار ناصر: یہ موقف صحابہ میں بھی اور تابعین میں بھی ایک گروہ کا رہا ہے۔ اس موقف کا ماخذ یہ دکھائی دیتا ہے کہ قرآن مجید میں وضو کی آیت جس اسلوب میں آئی ہے، اس میں اگر آپ 'ارجلکم' کو قریبی فعل سے جوڑیں تو وہ مسح ہے، جس کا مطلب یہ بنتا ہے کہ پاؤں کا مسح کرو۔ اب یہ حضرات جب آیت کو پڑھتے ہیں تو ایسا ہی لگتا ہے کہ یہاں دو فعل ذکر ہوئے ہیں اور دونوں کے تحت دو دو اعضا ہیں، لیکن جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے عمل کو دیکھتے ہیں تو وہ اس کے خلاف ہے۔ ظاہر ہے، اس کی انھوں نے کوئی توجیہ یا تفہیم کرنی ہے تو ان کو زیادہ بہتر یہ تفہیم لگی کہ حکم تو اللہ نے مسح کا ہی دیا تھا، لیکن دھونے سے منع تو نہیں کیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی مزید طہارت کے پہلو سے مسح پر اکتفا کرنے کے بجاے پاؤں دھونے پر عمل کیا اور لوگوں نے بھی اسی کو اختیار کر لیا، لیکن اصل میں فرض اللہ تعالیٰ نے مسح ہی کیا تھا۔ میرے خیال میں وہ اس کو اس طرح دیکھتے ہیں۔

مطیع سید: اہلِ تشیع کے ہاں پاؤں پر مسح کی روایت کیسے پیدا ہوئی؟

عمار ناصر: میرا خیال ہے کہ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ اہلِ بیت میں ایک بڑے عالم ہیں، اس طرح اور بھی لوگ ہوں گے، انھوں نے ان کا موقف لے لیا۔ کافی عرصے تک اس اختلاف میں شیعہ سنی شناخت کا پہلو شامل نہیں تھا۔ شروع کے دور میں دیکھیں تو کئی تابعین یہی موقف رکھتے تھے، بلکہ آپ بدر الدین زرکشی کی ''البرہان'' دیکھیں جو آٹھویں صدی ہجری کے عالم ہیں، تو وہ بھی یہی راے بیان کر رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تو مسح کا ہی حکم دیا ہے۔

مطیع سید: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اونٹ کا گوشت کھانے کے بعد وضو کرو اور بکری کا گوشت کھانے کے بعد اس کی ضرورت نہیں۔[9] فقہا میں بھی اس پر بحث ہے کہ اونٹ کا گوشت

---

[8] ۔ کتاب الطہارۃ وسننھا، باب ماجاء فی غسل القدمین، رقم 458۔

[9] ۔ کتاب الطہارۃ وسننھا، باب ماجاء فی الوضوء من لحوم الابل، رقم 497-496۔

ناقض وضو ہے کہ نہیں۔ اونٹ کے گوشت کے حوالے سے اس بات کا کیا پس منظر ہے؟

عمار ناصر: اس میں دو باتیں ہیں: ایک بات تو روایات سے بھی اور صحابہ کے عمل سے بھی واضح ہوتی ہے کہ یہ حکم استحباب کے پہلو سے ہے، اس کو نواقض کی بحث میں نہیں لانا چاہیے۔ جیسے اونٹ کے گوشت کی روایت ہے، اسی طرح آگ پر پکی ہوئی چیز کھانے اور شرم گاہ کو ہاتھ لگ جانے کے بعد وضو کی روایات بھی ہیں۔ فقہا جب اس کو یوں لیتے ہیں کہ ان چیزوں سے وضو ٹوٹ جاتا ہے تو پھر بحث ہی اور ہو جاتی ہے۔ پھر ناسخ و منسوخ کی اور ترجیح کی بحثیں شروع ہو جاتی ہیں، لیکن آپ اس کو اس پہلو سے دیکھیں کہ جیسے فرائض کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نوافل بتاتے ہیں، اسی طرح وضو برقرار ہوتے ہوئے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم استحباباً وضو کر لیتے تھے۔ تو مذکورہ مختلف اعمال کے بعد بھی اسی پہلو سے فرمایا کہ استحباباً وضو کر لیا جائے۔ یہ صرف ایک فقہی چیز نہیں ہے، ایک روحانی چیز بھی ہے۔ اس پہلو سے اس کو دیکھا جائے تو اشکال ختم ہو جاتا ہے۔ البتہ یہ سوال رہ جاتا ہے کہ اونٹ کا گوشت کھانے میں ایسی کیا چیز ہو سکتی ہے جو بکری کا گوشت کھانے میں نہیں ہے۔ اس کی شارحین مختلف توجیہات بیان کرتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ اس کے گوشت کی چکناہٹ وجہ ہو سکتی ہے۔ بعض یہ کہتے ہیں کہ جیسے اونٹوں کے باڑوں میں نماز پڑھنے سے منع کیا گیا، کیونکہ ان کے ساتھ جنات یا شیاطین کی ایک مناسبت ہے، تو شاید اسی پہلو سے اونٹ کے گوشت کو بھی دیکھا گیا ہو۔ اس کے علاوہ بھی کوئی بہت لطیف چیز ہو سکتی ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے علم میں ہو اور اس کی بنا پر آپ نے پسند فرمایا ہو کہ اونٹ کا گوشت کھانے کے بعد وضو کر لینا چاہیے۔

مطیع سید: جس قوم کے بھی اعمال خراب ہو جاتے ہیں، وہ مسجدوں کو آراستہ کرنے لگتے ہیں۔[10] اس کا کیا مفہوم ہے؟

عمار ناصر: مطلب یہ ہے کہ کسی قوم کی اخلاقی و دینی حالت کے بگاڑ کی ایک بڑی علامت یہ ہے کہ وہ عبادت گاہوں کی زیبایش کی طرف بہت زیادہ متوجہ ہو جاتی ہے۔ یہاں اصل چیز جس کی طرف متوجہ کرنا مقصود ہے، وہ مساجد کی زیبایش کی ممانعت نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ

---

[10] ۔ کتاب المساجد والجماعات، باب تشیید المساجد، رقم 741۔

رویہ پیدا کیوں ہوتا ہے؟ یہ تب ہوتا ہے جب لوگ اصل کاموں کی جگہ دکھاوے اور نمایش کی چیزوں کو اہمیت دینے لگتے ہیں، اور یہ کر کے سمجھتے ہیں کہ انھوں نے دین کا بڑا کام کر لیا ہے۔ یہاں اس رویے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ بڑی خوب صورت مسجد بنا دی، جب کہ اللہ تعالیٰ تو یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ آپ نماز کیسی پڑھتے ہیں۔

مطیع سید: ایک صحابی تندرست ہیں، وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کر رہے ہیں کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، میرے گھر تشریف لایئے، میں گھر میں نماز کے لیے ایک جگہ مختص کرنا چاہتا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے گھر تشریف لے جاتے ہیں اور نماز بھی پڑھتے ہیں جب کہ ایک دوسری روایت میں حضرت ابن ام مکتوم آپ سے گھر میں نماز پڑھ لینے کی اجازت طلب کرتے ہیں تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں تمھارے لیے اس بارے میں کوئی رخصت نہیں پاتا، 'لا اجد لك رخصة'۔[11]

عمار ناصر: یہ دو مختلف باتیں ہیں۔ پہلے صحابی گھر میں نفل نماز کے لیے کہہ رہے ہیں۔ وہ چاہ رہے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اگر ایک جگہ نماز پڑھ لیں گے تو وہ میرے لیے بابرکت ہو جائے گی اور جو ابن ام مکتوم ہیں، وہ فرض نماز سے رخصت چاہ رہے تھے۔

مطیع سید: لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا عذر نہیں مانا، حالاں کہ ان کے پاس معقول عذر تھا، جسے مانا بھی جا سکتا تھا۔

عمار ناصر: اس طرح کے ایک دوسرے واقعہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عذر مانا بھی ہے۔ ایک دوسرے صحابی تھے، جن کو آپ نے یہ رخصت دے دی تھی، اس لیے فقہا اس سے یہ حکم اخذ نہیں کرتے کہ ایسا عذر ناقابل قابلِ قبول ہے۔ وہ اس روایت ہی کی کوئی توجیہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ کوئی اور وجہ ہو گی، جس کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں چاہا کہ ابن ام مکتوم گھر پر نماز پڑھیں، لیکن ظاہراً آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں یوں کہا کہ رخصت نہیں ہے۔ ان کے ذمے مسجد میں اذان دینا بھی تھا۔

مطیع سید: یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس دور میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے ہوں کہ مسلمان

---

[11] ۔ کتاب المساجد والجماعات، باب التغلیظ فی التخلف عن الجماعۃ، رقم 792۔

زیادہ سے زیادہ جماعت میں شریک ہوں؟

عمار ناصر: یہ بھی ہو سکتا ہے، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ابن ام مکتوم کے ذمے مسجد میں کوئی ڈیوٹی تھی، مثلاً وہ اذان دیتے تھے، اور جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں نہیں ہوتے تھے تو امامت بھی کرتے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ ان کا شخصی اعزاز بھی پیشِ نظر ہو۔ ہو سکتا ہے کہ ان کے نابینا ہونے کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو جو ذمہ داریاں دے رہے تھے، اس سے ایک مثال قائم کرنا مقصود ہو یا ہو سکتا ہے کہ کوئی اور پہلو ملحوظِ خاطر ہو۔ یہ ہمیں معلوم نہیں کہ متعین طور پر کیا چیز تھی، جس کی وجہ سے ان کو رخصت نہیں دی گئی۔

[باقی]

گفتگو: محمد حسن الیاس

ترتیب و تدوین: شاہد رضا

# دین میں ڈاڑھی کا تصور

(1)

[ڈاڑھی کے حوالے سے ''23 اعتراضات سیریز'' کے ایک پروگرام کا خلاصہ جناب محمد حسن الیاس صاحب نے بیان کیا ہے۔ زیر نظر تحریر انھی کی گفتگو سے اخذ و استفادہ پر مبنی ہے۔]

## جناب جاوید احمد غامدی کا موقف

مسلمانوں کے ہاں ڈاڑھی (beard) ایک بہت ہی حساس مسئلہ ہے۔ ان کے ہاں ڈاڑھی رکھنا ایک فریضہ، جب کہ اسے نہ رکھنا گناہ تصور کیا جاتا ہے۔ استاذ گرامی جناب جاوید احمد صاحب غامدی کے نزدیک ڈاڑھی دین کا کوئی حکم نہیں ہے، یعنی دین نے ہمیں اس بات کا پابند نہیں کیا کہ ہم ڈاڑھی رکھیں۔ اپنے اس موقف کو انھوں نے اپنی ''23 اعتراضات سیریز'' میں بہت تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔

دین کے معاملے میں یہ بات تو طے ہے کہ روے زمین پر دین کا تنہا ماخذ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والا صفات ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں یہ دین دو صورتوں میں دیا ہے:

ایک قرآن،

دوسرے سنت۔

جب ہم قرآن کو دیکھتے ہیں تو اس میں ہمیں ڈاڑھی کے بارے میں کوئی بھی آیت نظر نہیں آتی۔ سنت کے بارے میں ہم جانتے ہیں کہ یہ پیغمبروں کی روایت (tradition) ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنت میں دین کے عملی احکام کو، جیسا کہ یہ پچھلے انبیا کی تہذیبی روایتوں (tradition of prophets) میں چلے آ رہے تھے، اپنے ترمیم و اضافے اور تجدید (renewal) سے آگے پہنچا دیا۔ چونکہ ڈاڑھی ایک عملی روایت تھی اور اس نے عمل سے منتقل ہونا تھا، اس لیے مسلمانوں کے تواتر عملی (practical continuation) کے ذریعے سے بھی اس طرح کی کوئی ہدایت ہم تک نہیں پہنچی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر ڈاڑھی کا ذکر کس جگہ پر آیا ہے؟ یہ بات کہاں بیان ہوئی ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو کہا ہے کہ ڈاڑھی رکھو؟ تو یہ سب مواد ہمیں احادیث میں ملتا ہے۔ احادیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو ڈاڑھی بڑھانے کی ہدایت فرمائی ہے۔ حدیث کے بارے میں یہ بات طے ہے کہ اس میں دین سے متعلق جو بھی ہدایت آئے گی، اس کو قرآن مجید کے مقرر کردہ فور کارنرز (four-corners) کے اندر بیٹھنا ہے۔ دین سے متعلق جو ہدایات احادیث میں آتی ہیں، ان کی تفصیل یہ ہے کہ ان میں قرآن کی کسی اصولی ہدایت کی تفہیم ہے، اس کو سمجھایا گیا ہے، اس کی شرح و وضاحت ہے، اس کے لازم عقلی تقاضے (logical requirements) یا لسانی تقاضے (linguistic requirements) بیان کیے گئے ہیں یا پھر حدیث کے اندر کوئی ایسی چیز، کوئی اصول بیان ہوا تھا جس کا پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اطلاق کیا ہے۔

چنانچہ حدیث کے بارے میں دو باتیں ملحوظ رہنی چاہییں:

اولاً، یہ کہ حدیث میں جو بھی بات آئے گی، سب سے پہلے یہ دریافت کیا جائے گا کہ اس سے قرآن کے کس اصول (principle) کو سمجھایا گیا ہے اور وہ کس اصول کا اطلاق (application) ہے، کیونکہ ایسا نہیں ہو سکتا کہ حدیث میں ہم ایسی بات کو قبول کر لیں جو قرآن مجید کے لیے اجنبی و اضافی (independent) ہو یا قرآن مجید کے قائم کردہ فور کارنرز سے باہر نکلتی ہو۔

ثانیاً، یہ کہ ہم یہ جانتے ہیں کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ باتیں لوگوں نے اپنے طور پر سن کر آگے منتقل کی ہیں، لہٰذا ہمیں تحقیق کرنی پڑتی ہے کہ ان کے ذریعے سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم

کی نسبت سے جو باتیں ہم تک پہنچی ہیں، وہ سند کے معیار (verified chain of transmission) پر پوری اترتی ہیں یا نہیں۔

آیئے، اب دیکھتے ہیں کہ ڈاڑھی سے متعلق احادیث میں کیا وارد ہوا ہے اور استاذ محترم جناب جاوید احمد غامدی صاحب نے ان کو کیسے دیکھا یا کیسے سمجھا ہے۔ چنانچہ ڈاڑھی سے متعلق احادیث کو ہم دو اقسام میں تقسیم کرتے ہیں:

1۔ وضع قطع سے متعلق احادیث

2۔ ڈاڑھی سے متعلق احادیث

پہلی قسم وہ ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے لوگوں کی متکبرانہ وضع قطع پر تبصرہ فرمایا ہے جو اوباشوں کے انداز میں بڑی بڑی مونچھیں رکھتے تھے اور ڈاڑھی بہت چھوٹی رکھتے تھے۔ یہ مغرور (arrogant) اور خود پسند (overween) لوگوں کا ایک انداز تھا۔ قرآن مجید نے تکبر سے منع کیا ہے اور بتایا ہے کہ اونٹ سوئی کے ناکے میں داخل ہو سکتا ہے، لیکن تکبر کرنے والا جنت میں داخل نہیں ہو سکتا۔[1] چنانچہ یہی اصول ہے جو عاجزی (humility) اور فروتنی (humbleness) کے خلاف ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کو سخت ناپسند ہے۔ اسی اصول کار سالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے ان روایات میں اطلاق کیا ہے۔ چنانچہ غامدی صاحب کے مطابق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو بات ان روایات میں بیان کر رہے ہیں، وہ یہ ہر گز نہیں ہے کہ مسلمانوں کو لازماً ڈاڑھی بڑھانی ہے، بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم صرف توجہ دلا رہے ہیں کہ جو لوگ چھوٹی ڈاڑھی کے ساتھ ساتھ بڑی بڑی مونچھیں رکھ کر اپنی وضع قطع کو متکبرانہ (arrogant) بنا دیتے ہیں، یہ دین میں ناپسندیدہ اور غیر مطلوب (unwanted) ہے۔ اس سے ہر شخص کو بچنا چاہیے۔

یہ مشاہدے کی بات ہے کہ اکثر لوگ بڑی بڑی مونچھیں رکھتے ہیں اور ان کو تاؤ دیتے ہیں، بل

---

[1] ۔ الاعراف 7: 40۔ 'اِنَّ الَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَاسْتَکْبَرُوْا عَنْھَا لَا تُفَتَّحُ لَھُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَلَا یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّۃَ حَتّٰی یَلِجَ الْجَمَلُ فِیْ سَمِّ الْخِیَاطِ' (یہ قطعی ہے کہ جنھوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور تکبر کر کے اُن سے منہ موڑا ہے، اُن کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے اور وہ ہر گز جنت میں داخل نہیں ہوں گے، جب تک اونٹ سوئی کے ناکے سے نہ گزر جائے)۔

دیتے ہیں اور اس سے لوگوں پر اپنی ہیبت، رعب، برتری اور تفوق (inferiority and terror) قائم کرنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر کچھ بڑھانا ہی ہے تو ڈاڑھی بڑھاؤ اور مونچھیں چھوٹی کر لو، یعنی اگر تمھیں شوق ہی ہے کہ تمھارے منہ پر بڑے بال ہونے چاہییں تو ڈاڑھی بڑھا لو، اس لیے کہ ڈاڑھی جب بڑے گی تو ڈاڑھی کا بڑا ہونا یہ بہ ظاہر تکبر کی علامت نہیں ہے۔

ہماری انسانی تاریخ، رویوں اور تاملات (reflections) میں ہمیشہ مونچھیں ہی بڑی کر کے تکبر کا اظہار کیا جاتا ہے، نہ کہ ڈاڑھی بڑی کر کے۔ جب مونچھیں بڑی کی جاتی ہیں تو لازماً ڈاڑھی چھوٹی کی جاتی ہے تاکہ جو بڑی چیز ہے، اس کو مزید بڑا یا نمایاں کیا جائے۔ عام طور پر لوگ ڈاڑھی اور مونچھیں، دونوں بڑی نہیں کرتے، لیکن بڑی بڑی مونچھیں رکھتے ہیں۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر کچھ بڑھانے کا شوق ہے تو ڈاڑھیوں کو بڑھا لو اور مونچھوں کو چھوٹا رکھو۔

اس باب کی جو روایات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہیں، وہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی روایت ہوئی ہیں اور دیگر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے بھی۔ چنانچہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے صحیح مسلم کی ایک مشہور روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

خَالِفُوا الْمُشْرِكِيْنَ، أَحْفُوا الشَّوَارِبَ، وَأَوْفُوا اللِّحٰى. (رقم 259)

”ان مشرکوں کی مخالفت کرو، اپنی مونچھیں چھوٹی کرو اور اپنی ڈاڑھیاں بڑھاؤ۔“

اسی طرح ایک روایت میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی نسبت سے آتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

جُزُّوا الشَّوَارِبَ، وَأَعْفُوا اللِّحٰى، وَخَالِفُوا الْمَجُوْسَ. (مسند احمد، رقم 8785)

”اپنی مونچھیں چھوٹی کرو، ڈاڑھیاں بڑھاؤ اور ان مجوسیوں کی مخالفت کرو۔“

”اور ان مجوسیوں کی مخالفت کرو“، یہ بڑی اہم بات ہے۔ گویا اللہ کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بتایا ہے کہ اگر تم نے تکبر اپنایا اور تکبر کی وجہ سے یہ کام کیا تو غیر مسلموں کی پیروی کی، کیونکہ یہ عادت اصل میں اس زمانے کے غیر مسلموں، یعنی مجوسیوں اور مشرکوں کی تھی۔ اس

کام سے بچو اور اگر کچھ کرنا ہی چاہتے ہو تو ڈاڑھی بڑھالو اور مونچھیں کم کرو۔ یہاں بھی دیکھ سکتے ہیں کہ اللہ کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم یہ نہیں کہہ رہے کہ لازمی ڈاڑھیاں بڑی کرنی ہیں، بلکہ آگے جو فرمایا کہ ”اِن مشرکوں کی مخالفت کرو“، ”اِن مجوسیوں کی مخالفت کرو“ تو اس سے بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ جس مقصد سے اُنھوں نے یہ کام کیا تھا، اس سے ہمیں اتفاق نہیں ہے، کیونکہ ہمارا دینی نظریہ (religious doctrine)، ہمارا اصول اور قرآن مجید کی ہدایت اس سے ہم آہنگ نہیں ہے۔

دوسری قسم کی روایات وہ ہیں جن میں ڈاڑھی کا ذکر ہے۔ ان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ماننے والوں کو اہل کتاب کی بعض بدعات کے بارے میں خبردار کر رہے اور ان سے منع کر رہے ہیں۔ ان اہل کتاب میں بڑی بڑی مونچھیں رکھنا اور ڈاڑھی کو چھوٹا رکھنا مذہبی عبادت کے طور پر رائج تھا، یعنی انھوں نے اسے دینی نظریے کے طور پر اپنایا ہوا تھا، جب کہ یہ ان کی اپنی ایجاد کردہ بدعت (deviation) تھی۔ ہم جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جب بھی پیغمبروں کو مبعوث فرماتا ہے تو وہ اللہ اور مذہب کے نام پر رائج غلط تصورات اور بدعات کو ختم کرتے اور ان پر لوگوں کو توجہ دلاتے ہیں۔ چنانچہ اس قسم کی احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو ان بدعات سے دور رہنے کی ہدایت فرمائی ہے۔

اس حوالے سے جو احادیث آئی ہیں، ان سے واضح ہے کہ ان میں مذہب کے نام پر کسی نئی ایجاد اور ذاتی اختراع (self-creation) کی مخالفت کی گئی ہے۔ اس سلسلے کی روایت حضرت ابو امامہ باہلی رضی اللہ عنہ کی نسبت سے ہم تک پہنچتی ہے۔ چنانچہ وہ روایت کرتے ہیں:

| | |
|---|---|
| خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى مَشْيَخَةٍ مِنَ الْاَنْصَارِ بِيضٌ لِحَاهُمْ، فَقَالَ: يَا مَعْشَرَ الْاَنْصَارِ، حَمِّرُوْا وَصَفِّرُوْا، وَخَالِفُوْا أَهْلَ الْكِتَابِ. قَالَ: فَقُلْنَا: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ، إِنَّ أَهْلَ الْكِتَابِ يَتَسَرْوَلُوْنَ، وَلَا يَأْتَزِرُوْنَ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: تَسَرْوَلُوْا، وَائْتَزِرُوْا، وَخَالِفُوْا | ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انصار کے کچھ بڑے بوڑھوں کی مجلس میں، جن کی ڈاڑھیاں سفید ہو چکی تھیں، تشریف لائے تو اُن سے کہا: انصار کے لوگو، اپنی ڈاڑھیوں کو سرخ یا زرد کر لیا کرو اور اِس معاملے میں اہل کتاب کی مخالفت کرو۔ ابو امامہ کہتے ہیں کہ اِس پر ہم نے سوال |

أَهْلَ الْكِتَابِ. قَالَ: فَقُلْنَا: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ، إِنَّ أَهْلَ الْكِتَابِ يَتَخَفَّفُوْنَ، وَلَا يَنْتَعِلُوْنَ. قَالَ: فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: فَتَخَفَّفُوْا، وَانْتَعِلُوْا، وَخَالِفُوْا أَهْلَ الْكِتَابِ. قَالَ: فَقُلْنَا: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ، إِنَّ أَهْلَ الْكِتَابِ يَقُصُّوْنَ عَثَانِيْنَهُمْ، وَيُوَفِّرُوْنَ سِبَالَهُمْ. قَالَ: فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: قُصُّوْا سِبَالَكُمْ، وَوَفِّرُوْا عَثَانِيْنَكُمْ، وَخَالِفُوْا أَهْلَ الْكِتَابِ.

(مسند احمد، رقم 22283)

کیا: یا رسول اللہ، (پھر اِس کا کیا حکم ہے کہ) اہل کتاب شلوار پہنتے ہیں، وہ لنگی (تہ بند) نہیں باندھتے؟ آپ نے فرمایا: تم شلوار بھی پہنو اور لنگی بھی باندھو اور اِس معاملے میں بھی اُن کی مخالفت کرو۔ ہم نے پھر سوال کیا: (اور اِس کا کہ) اہل کتاب موزے پہنتے ہیں، وہ جوتے نہیں پہنتے؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم موزے بھی پہنو اور جوتے بھی اور اِس معاملے میں بھی اہل کتاب کی مخالفت کرو۔ ہم نے سوال کیا: یا رسول اللہ، (اور اِس کا کہ) اہل کتاب ڈاڑھی کتراتے اور مونچھیں خوب بڑھاتے ہیں؟ ابو امامہ کہتے ہیں کہ اِس پر بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم مونچھیں تراشا کرو اور ڈاڑھیوں کو خوب بڑھنے دو، (جس طرح وہ مونچھوں کو بڑھنے دیتے ہیں) اور اِس معاملے میں بھی اہل کتاب کی مخالفت کرو۔‘‘

اس روایت کے موضوع، سیاق و سباق (context)، مخاطبین کے سوالات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شرح و وضاحت پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس روایت میں انصار کے لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ڈاڑھی کے علاوہ اہل کتاب کی بعض دوسری چیزوں کے بارے میں بھی سوال کیا ہے۔ اس روایت میں چار بنیادی نکات بیان ہوئے ہیں:

1۔ یہ کہ جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطبین تھے، ان کی ڈاڑھیاں سفید تھیں

اور ان کو رنگنے میں کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ جیسا کہ عام طور پر ہم دیکھتے ہیں کہ جو بزرگ ہوتے ہیں، ان کی ڈاڑھیاں سفید ہوتی ہیں۔ انھیں دیکھ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ ایسا نہیں ہونا چاہیے، اور ان انصار کو مشورہ دیا کہ ”اپنی ڈاڑھیاں سرخ یا زرد رنگ سے رنگو اور ان اہل کتاب کی مخالفت کرو“۔ کیونکہ اگر وہ سمجھتے ہیں کہ مذہبی طور پر ڈاڑھی کو رنگنا غلط بات ہے تو یہ اُن کی خود ساختہ (self assumed) بات ہے، جو کہ حقیقت اور مذہب کے خلاف ہے۔ لہٰذا اس میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے کہ تم اپنی ڈاڑھیوں کو رنگو۔

2۔ یہ کہ انصار نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اے نبی، اہل کتاب شلوار پہنتے ہیں، لیکن لنگی نہیں پہنتے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم شلوار اور لنگی، دونوں پہنو اور اہل کتاب کی مخالفت کرو۔ یہ بھی ان کی ایک مذہبی بدعت تھی کہ اہل کتاب شلوار پہنتے تھے، مگر لنگی نہیں پہنتے تھے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جب سوال ہوا تو آپ نے جواب میں کہا کہ تم پر ایسی کوئی پابندی نہیں ہے، تم شلوار اور لنگی، دونوں پہن سکتے ہو۔ اس میں دینی لحاظ سے کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔ پھر اسی روایت میں یہ الفاظ آتے ہیں کہ ”اس معاملے میں بھی اہل کتاب کی مخالفت کرو“۔

3۔ انصار کے لوگوں نے پوچھا کہ اے نبی، اہل کتاب نماز میں موزے پہنتے ہیں، لیکن جوتے نہیں پہنتے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جوتے اور موزے، دونوں پہنو اور اس معاملے میں بھی اہل کتاب کی مخالفت کرو۔ گویا یہ بھی ان کی طرف سے ایک مذہبی بدعت اور اختراع ہے کہ وہ نماز میں موزے پہنتے تھے، مگر جوتے نہیں پہنتے تھے۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کے لوگوں کو توجہ دلائی کہ اس معاملے میں بھی ان کی مخالفت کرو۔

4۔ اسی تسلسل میں انصار نے یہ سوال بھی کیا کہ اے نبی، اہل کتاب بڑی بڑی مونچھیں رکھتے ہیں اور ڈاڑھیاں منڈاتے ہیں، تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنی مونچھیں چھوٹی کرو اور ڈاڑھیاں لمبی کرو، اور اس معاملے میں بھی اہل کتاب کی مخالفت کرو۔

اس روایت سے واضح ہے کہ یہ چاروں نکات اور سوالات ایک مذہبی بدعت اور اختراع کے بارے میں کیے گئے تھے، جو لوگوں نے مذہب کے نام پر ایجاد کر لی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان بدعات کے بارے میں یہ جواب دے رہے ہیں کہ اگر تم یہ کام کرتے ہو تو اس میں کوئی

حرج نہیں ہے۔ لہٰذا اگر تم شلوار اور لنگی پہننا چاہتے ہو تو کوئی حرج کی بات نہیں ہے، تم ڈاڑھیاں رنگنا چاہتے ہو تو کوئی حرج کی بات نہیں ہے، تم موزے اور جوتے، دونوں پہن کر نماز پڑھنا چاہتے ہو تو اس میں بھی کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔ اسی طرح اگر وہ یہ سمجھتے ہیں کہ مونچھیں بڑی رکھنا اور ڈاڑھی کاٹنا ضروری ہے تو تم ڈاڑھیاں بڑھالو اور مونچھیں چھوٹی رکھ لو تو اس میں بھی کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔

اس روایت میں سرے سے یہ چیز زیر بحث ہی نہیں ہے کہ اللہ کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ڈاڑھی کا حکم لوگوں میں منتقل کر رہے ہیں، بلکہ یہ لوگوں کا ایک بدعت کے بارے میں سوال ہے، جس کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو جواب دے رہے ہیں۔ چنانچہ غامدی صاحب کے مطابق دونوں قسم کی احادیث میں کہیں بھی اصلاً مسلمانوں کو ڈاڑھی بڑھانے کا کوئی حکم نہیں دیا گیا ہے۔

پہلی قسم کی روایات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے متکبرانہ وضع قطع اپنانے پر تبصرہ فرمایا ہے اور دوسری قسم کی روایات میں رائج بدعات کی مخالفت کی اور لوگوں کو بتایا ہے کہ ان کو اپنانے میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔ چنانچہ ان احادیث میں سرے سے ڈاڑھی رکھنے کا حکم زیر بحث ہی نہیں ہے۔

[باقی]

محمد غطریف شہباز ندوی

# قضية الإلحاد

على النقيض من الله الذى يدعو الدين إلى الإيمان به ،كان هناك دائمًا أولئك الذين يعتبرون كونَنا هذا هو خالق الإنسان وربه. وهذا ما يسمى الإلحاد. وكان قبل القرن السابع عشر الهيمنة السياسية للدين والفكر الدينى قائمةً على مستوى العالم.وقد استمرت هذه الهيمنة لاكثر من ألف عام بعد مبعث النبى صلى الله عليه وسلم. فهذه هى الفترة المذكورة فى الكتب المقدسة الإلهية لذلك. ( راجع إلى الكتاب المقدس، رؤيا يوحنا ٢٠ : ٧-٩ )وبما أنها كانت نبوءةَ رُسل الله ،لذلك فقد تحققت نصًا وروحًا، والآن انتهت هذه الهيمنة فى جميع أنحاء العالم. وفى الجو الذى خلقه ذلك الفراغ، أصبح دعاة الإلحاد بارزين بأعداد كبيرة ،فهم الآن يعرضون قضيتهم ضد الدين باقتناع كامل.

وإن الاعتراضات التى يتم فيها تقديم هذه القضية مضمونةً بشكل أساسى تتمخض فى أربع إيرادات. وسنشرح فى السطور الآتية الطريقة التى أجاب بها القرآن عليها:

الاعتراض الاول هو أن مفهوم الله الواحد هو نتيجة التطور الفكرى للإنسان. ومن هنا يمكننا أن نرى أنه لا يوجد أى أثر للإله الذى قدمه القرآن، فى التاريخ المبكر للإنسان. فأينما نظرت إليه ،فإن مظاهر الشرك تتواجد فى كل مكان فيه ،لكن التوحيد لا يُرى فى أى

مکان. ومن ثم، فإن الحقیقة ھی أن فکرة الإلہ الواحد قد ظھرت تدریجیًا فی ھذا التاریخ، وذلك أیضا برعایة ظروف من یقدمونھا فمثلاً ظھرت کملك فی بعض الاماکن، وکزوج فخور فی بعض الاماکن، وکزعیم دینی متعاطف مع الفقراء فی بعض الاماکن، ولیس ھذا فحسب ، بل جلب الإنسان معه أیضًا تقالیدَ الادیان المتعددة الآلھة من ھذه الرحلة ، وکان یطالب بجعلھا خاصة لنفسه فی جمیع الازمان. فکیف یمکن للإنسان العاقل أن یقبل ھذا الإلہ الذی صنعه الإنسان بنفسه کخالقه وسیده وإلھه؟

وردًا علی ھذا الاعتراض، یمکن لنا أن نقول إن أسطورة التطور ھذه مجرد أسطورة. ولا یمکن العثور علی أی أساس لذلك فی عالم الحقائق. إن ما ھو معروف حتی الآن عن تاریخ الفکر الدینی للإنسان یمکن إرجاعه إلی خمسة آلاف سنة. ولکن ما ھو عمر الإنسان علی الارض؟ وفی ضوء التحقیقات التی تم إجراؤھا حتی الآن و تم تقدیرھا فھذا حدث وقع منذ آلاف وآلاف السنین قبله. وبعد ذلك، ما الذی یمکن أن یکذب قول القرآن أن البشر کانوا علی دین واحد فی البدایة؟

وقد تم توجیھه لھم من قبل ربھم نفسه. وتسللت الانحرافات فی فکرھم الدینی فی وقت ما بعد ذلك، مما أدی إلی انشقاقات فتفرقوا. فالشرك شیء ولید من ذلك العصر من التفرق والتشتت. ومن ثم فمن المؤکد أن رحلة الفکر الدینی لم تکن من الشرك إلی التوحید، بل علی عکس منه من التوحید إلی الشرك. کما قال تعالی:

وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّا اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِیَ بَیْنَھُمْ فِیْمَا فِیْهِ یَخْتَلِفُوْنَ. (یونس ۱۰:۱۹)

وتاریخ الالفی سنة الماضیة یشھد أیضًا علی ھذه الحقیقة. ویعرف العلماء أن ھذا التاریخ بدأ بالدعوة إلی التوحید علی ید إثنین من أعظم رُسل اللّٰه المسیح ومحمد. ولکن بعد ذلك انظر ما أحدثه خلیط الفلسفة والتصوف من انحرافات فی تعالیمھما، حتی جعله أتباع المسیح نفسه ابنًا للّٰه وأمه أمَ الرب، وھم یدعونھما ویناجون منھما، وفی أتباع محمد (علیه السلام) ھناك من الناس من یری "أحد" فی حجاب أحمد فرق بینھما میم فقط، فیصرخ فی عالم الجذب والکیف:

وہی جو مستوی عرش تھا خدا ہو کر
اتر پڑا ہے مدینے میں مصطفیٰ ہو کر

(إن الذی کان مستویًا علی العرش فی السماء هو الذی نزل إلی المدینة فی صفته المصطفویة المحمدیة.)

وبعد ذلك، لاتحتاج هذه الحقیقة إلی دلیل أن الطقوس التعبدیة ومراسمها قد تم تعیینها فی الاصل من قِبل الله وخالصةً لله، ولکن عندما خلق الشرك آلهته، فتبناها المشرکون لآلهتهم أیضًا مع بعض التعدیلات.

لذلك، عندما بعث الانبیاء، کان أکبر مطلب للناس فی دعوتهم هو أن یا أیها الناس، هذه الطقوس ومراسم العبودیة هی خاصة بالله فقط ویجب أن تظل خاصة به، لانه وحده هو ربکم، وهو ملك الکون وهو الإله الواحد، لا إله إلا هو.

وأما أن مفهوم الله یبدو غیر متجانس فی الکتب المقدسة الإلهیة هو ببساطة بسبب سوء الفهم. هذه الکتب المقدسة هی من روائع البیان الادبی. لذلك، ولذا یمکن فصل آیاته عن البیانات التاریخیة لمؤلفیه فی کل مقام ویمکن إظهار کیف حاول الناس فهمها وتفسیرها مع نقص المعرفة والافتقار إلی اللباقة الادبیة وعدم الذوق الادبی، وبالتالی دمروا کل جمالها بتفسیراتهم. ولذا یصدق القول إن قیل عنهم:

من ذهب بشعری إلی أهل المدرسة (الذین لایستطعون فهمه)

الاعتراض الثانی هو أن الطریقة التی یفهم بها الناس الدین، والفکر الدینی الناتج عن ذاك الفهم هی مجموعة من التناقضات. إنه لا یتفق علی فکرة الله وتصوره، ولا علی صفاته وأفعاله، ولا علی طریقة تعامله مع الإنسان، ولا فی وصایاه وتعلیماته له، ولا علی مطالبه من الإنسان، ولا علی آرائه فی الإنسان والکون. فکأن الامر کما عبر به شاعر أردی:

لائے ہیں بزم ناز سے یار خبر الگ الگ

(إن اصحاب الحبیب قد جاؤوا بأخبار متفرقة متضاربة من حفلة حبه)

هل یمکن إذن أن یتوقع من صاحب عقل وشعور أن یفکر أو یؤمن بهذه المجموعة من التناقضات بأی درجة؟

والجواب على هذا الاعتراض هو أن هذه الاختلافات هی نتیجة حتمیة للقدرة الممنوحة للإنسان علی فهم الحقائق الوجودیة واستنباطها منها. فإن العجائب التی أظهرها الإنسان حتی الآن فی هذا العالم هی کل من فوائد هذه القدرة. لیس هناك شك فی أن المشاکل قد نشأت بسبب استخدامه ، ولکن ضع فی اعتبارك أن الشرف الحقیقی للإنسان هو هذه القدرة. الإنسان إنسان من أجلها وبسببها. لقد خلقه خالقه بهذه الطریقة وأعطی له معها الاخبار السارة عن الحیاة الابدیة. فکیف یتوقع أنه من أجل خلق الوحدة فی فهم إرشاده ، سوف یسلب هذه القدرة من الإنسان؟ بالطبع لا ، لقد أصدر حکمًا واضحًا بأن "لا إکراه فی الدین" ، ولذا لم یتعرض أحد للاضطهاد فی مسألة الدین ولن یتم ذلك مرة أخری مستقبلیًا.

ومع ذلك ، فهذا لا یعنی أن الإنسان قد تُرك وهُجر لیعیش فی متاهة الاختلافات نتیجةً لذلك. یقول القرآن أن دین الله هو نفسه وأن اسمه کان دائمًا "الإسلام" ، ولکن بمجرد ظهور هذا الموقف الاختلافی فی فهمه ، بدأ الله یرسل أنبیاءه إلی کل أمة وبعث أیضًا بکتبه معهم. وتم إنزال هذه الکتب بصفتها میزانًا وفرقانًا للتمییز بین الحق والباطل ، حتی یتمکن الناس من فصل خلافاتهم من خلالها ، وبالتالی إقامة العدل فی مسألة الحق. فقال تعالی:

کَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِیّٖنَ مُبَشِّرِیْنَ وَ مُنْذِرِیْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ لِیَحْکُمَ بَیْنَ النَّاسِ فِیْمَا اخْتَلَفُوْا فِیْهِ. (البقرة ۲: ۲۱۳)

والقرآن الکریم هو کتاب أخیر نهائی من هذه السلسلة ، فهو الآن کتاب واحد بین جمیع الکتب الإلهامیة للعالم ، الذی یمکن أن یقال بثقة کاملة إنه موجود فینا فی نفس اللغة ونفس الاسلوب ونفس الترتیب الذی نزل فیه بدون أدنی تغیر ولا تبدل. وتواتره هذا معجزة فی مکانه فإنه کتاب واحد فی العالم الذی یمکن للملایین من المسلمین أن یسمعونه من "الحمد" حتی "والناس" من حفظهم محضًا. والتاریخ یشهد أن هذا التسلسل لروایة هذا الکتاب وصیانته هو من جانب رب العالمین بنفسه.

وقد اشار القرآن نفسه إلى بعض الجوانب من صيانته من حين لاخر ومنها مايلى فى ألفاظ الاستاذ الإمام أمين أحسن الإصلاحى:

"أولًا أن الله تعالى قد اهتم اهتمامًا خاصًّا لكى لا تتدخل الشياطين فى الوحى القرآنى. وإن كان هذا اهتمامًا عامًّا فى الكون أن لا تستمع الشياطين ما يذكر بالملا الاعلى ولا تختلط ولكن كان هناك اهتمام خاص لكى لا تخطف الشياطين خطفة فى الوحى القرآنى، ولا يأتيه الباطل من بين يديه ولا من خلفه. وثانيًا الملك الذى تم انتخابه لهذا العمل الخطير وصفه القرآن "بذى قوة مُطاع ثَم أمين قوى عند ذى العرش مكين." فهو قوى لدرجة أن لا تغلبه الارواح الخبيثة وهو أمير الملائكة لا ينسى شيئًا فماذا يُسلم إلقاءه إليه يلقيه بأمانة كبيرة، ولا يسعه أن يكون هناك فرق كبير أو صغير فيها. وهو ملك مقرب عند الله تعالى وقربته تدل على أنه خير الملائكة وأفضلهم فى صلاحياته. وظاهر أن هذا أيضًا حتى لا يكون هناك إمكان ما لتدخل الباطل فيه من جانب منبعه.

وثالثًا البشر الذى تم انتخابه لتحمل هذه الامانة الكريمة هو خير الخلائق كلهم من كل الاعتبارات. ولم يحمله أن يحفظه ويصونه ويرتبه واحدًا بنفسه بل فرض الله ذلك على نفسه ولذا قال له فى سورة القيامة: لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَه وَقُرْاٰنَه فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَه ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَه (القيامة:١٦-١٩) فتقول الروايات أن النبى صلى الله عليه وسلم وصحابته الابرار كانوا يحفظون القرآن وكان النبى صلى الله عليه وسلم يذاكره كل عام فى شهر رمضان كى لا يكون هناك سهو ونسيان. وتكون المذاكرة بترتيب رضى ربه الله أن يدون عليه القرآن. وكما تقول الروايات أن النبى صلى الله عليه وسلم قد قام بهذه المذاكرة القرآنية مع جبرئيل الامين مرتين فى رمضان فى حياته الاخيرة ثم ضبط وكتابة وتدوين القرآن كله مطابقًا لقراءة العرضة الاخيرة هذه، وقام الخلفاء الراشدون ببعث نقوله إلى مدن وبلدان المملكة الإسلامية فى طولها وعرضها. ولم يحظ أى صحيفة من الصحف العتيقة بهذا الاهتمام الخاص حتى وأن صحف التوراة لا أحد يلم عليها بإلمام بأى زمن رتبت صحفها المختلفة وفى أى زمان وبواسطة من.

ورابعًا أن القرآن كلام معجز بسبب فصاحة ألفاظه وبلاغة معانيه، فلا يُرقع بكلام الغير حتى أن كلام النبى صلى الله عليه وسلم وهو الذى نزل عليه وهو أفصح العرب والعجم، لا يدانيه ولا يقابله، فلا إمكان أن يختلط به كلام الغير. فإن التاريخ قد احتفظ فى كتب التاريخ والادب نماذج من مزخرفات مدعى النبوة الكاذبين الذين تجاسروا على القول بكلام مصطنع بجواب القرآن. فقارن بينه وبينها وجدت فرقًا كفرق الجوهر الخالص والزخرفة. وبهذه الطريقة ، تم سد طريق التسلل إلى القرآن حتى من الخلف. كما قال: لا ياتيه الباطل من بين يديه ولا من خلفه. (حٰم السجدة ۴۱: ۴۲)

وخامسًا أن الله قد وعد بحفظ اللغة القرآنية مع صيانة القرآن إلى يوم القيامة. فإنه قد دخلت التحريفات الكثيرة التى لا تحصى فى الصحف السماوية الاخرى بسبب اندراس لغاتها الاصلية بطريق الترجمات. ولا يمكن التطرق إليها اليوم، ولكن لغة القرآن الاصلية محفوظة مصونة وتظل مصونة إلى يوم القيامة فلا يتطرق إليه أى باطل بطريق الترجمات والتفاسير. وإذا كانت هناك محاولة خبيثة لإدخال أى باطل فيه فبوسع أهل العلم أن يفرقوا ويميزوا بين الحق والباطل على المعيار الاصيل.“

(تدبر القرآن ۷/ ۱۱۲)

الاعتراض الثالث هو أن موقف الله الذى يدعوه الدين إلى الإيمان به قاس للغاية. إنه يقتل حتى الاطفال بكاءً بالامراض والمعاناة، ويذبح الملايين ومئات الملايين من الحيوانات كل يوم على أيدى البشر كما أنه يمكّن للحيوان أن يمزق حيوانا آخر، فهو لا يمسك بيد أى قاتل وظالم، بل يمنحهم فرصًا للتصدى والعدوان، ويخلق مخلوقات لا حصر لها فقط حتى يتمكن الإنسان من إصلاحها وإخضاعها وتسخيرها لعمله. حتى أنه يلهم البشر لقتل ومحاربة البشر ويعد المكافآت لهم على ذلك. وليس هذا فقط ، إن هذا العالم الذى خلقه ليس مثاليًا من جميع النواحى. فهناك زلازل ، هناك صواعق ، هناك جدب وجفاف وهناك آلام ، وليس هذا فقط بل فى بعض الاماكن يمكن أيضًا الإخبار عن عيوب. ثم كيف يمكننا أن نصدق أنه ذات رحمن ورحيم وحكيم ، عقله غير محدود وقدرته لانهائية ولا محدودة؟

وقد أجاب القرآن على هذا الاعتراض بالقول إن العالم الذى يكون فيه ظهور صفات الله فى الكمال وصفات المجد والجمال أصليًا لا يزال فى الغيب ،وقد خلق الإنسان لذلك العالم المستقبلى. وفى الوقت الحاضر، تم بناء الكون العظيم بادى ذى بدء ومليارات المجرات المنتشرة فى هذا العالم أمامه من غير ذى ذرع ، فهذا كله اعدادات بنائية لذاك العالم وهى مبعثرة فى الفضاء اللامحدود كالمعدات البنائية. يقول القرآن إن اليوم ليس بعيدًا عندما يُحَّول العالم الموجود إلى أرض وسماء أخرى ، ويخرج الكل ويحشرون للوقوف أمام الله وحده. ( إبراهيم: ٤٨ ) بعد ذلك يظهر عالم جديد ويكون نطاقه توسع الكون كله. فذلك عالم ظهور دينونة الله ونعمته ورحمته. أما عالمنا هذا الذى نفتح فيه أعين الوعى فهو ديباجة ذاك العالم وتمهيده. ولم يتم إقامته من أجل الدينونة ولا من أجل ظهور الكمال. وإنما الغرض منه هو فقط أن يكون ابتلاءً واختبارًا. فالكل هنا حتى الجن وأنس فى عرصة الاختبار. كما قال تعالى:

الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْغَفُوْرُ. ( الملك ٦٧: ٢ )

نتيجة لذلك لا يتم هنا فصل الحياة أبدًا عن الموت، والسعادة عن الحزن ،والمتعة عن الهم والغم ،والرضا عن القلق ،والراحة من الالم والنعمة من النقمة فى هذا العالم. لقد تم تجميعها معا مثل الزوجين. فهذا عالم من ندمات الماضى ومخاوف المستقبل. ومهما كانت المعرفة والحكمة التى أعطيت للإنسان، فقد أعطيت لفهم هذه الحقيقة. فيقول القرآن: ومن يعطى الحكمة فقد أوتى خيرًا كثيرًا. ( البقرة ٢: ٢٦٩ ) لانه بهذا يدرك الإنسان حدود معرفته ، وبدلاً من إلقاء اللوم على الله، يحاول فهم مخططه باعتراف عجزه أمامه ، ويدعو كل لحظة أن: رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا ( طٰهٰ: ١١٤ ) فإن أكبر حرمان للمعرفة والفلسفة هو فقدان هذه الحكمة. وهذا الاعتراض على الله ينشأ من هذا الحرمان ويسلم الإنسان إلى الابد للظلمات التى لم يعد أمامها من نور.

الاعتراض الرابع: أن الإنسان فى صغره ربما كان يحتاج إلى الدين، ولكنه الآن قد بلغ رشده ونضج عقله ، فقد تعلم من خلال علمه وعلومه القائمة على التجربة والملاحظة والاستقراء والاستنباط مفتاح حل كل مشكلة وتم اكتشافه. كما أنه بدأ

یفهم الکون من حوله إلی حد کبیر، وقام بإنشاء هیاکل وتشکیلات ومؤسسات اجتماعیة مبنیة علی قیم عالیة جدًا لتنظیم المجتمع واحتیاجات السیاسة والاقتصاد، ویمکن تقدیرها بالنظر فیها کم سامیة ومتفوقة معرفة الإنسان هذه مقارنةً بتلك القوانین والشرائع التی کان یطوق بها عنقه قرونًا عدیدة باسم الدین. فمَن إذن علی استعداد لقبول هذه الشرائع بأی درجة؟

وردًا علی هذا الاعتراض نقول: إن مثل هذه المقارنة لا یمکن إجراؤها إلا من قِبل أشخاص یجهلون الدین تمامًا. لانه لم یکن هدی الدین لشیء من هذه الامور قط. ولم ینزل لشرح قوانین العلم للإنسان، ولا لتلبیة احتیاجاته الطبیة، ولا لإنشاء الهیاکل والمؤسسات الاجتماعیة لتنظیم المجتمع واحتیاجات السیاسة والاقتصاد. لذلك، کل ما فعله الإنسان فی هذا العالم، کان علیه أن یفعله. لقد خلقه خالقه لهذا الغرض بمنحه قوی وقدرات غیر عادیة. أما غایة الدین فإنما هو تطهیر علم الإنسان وأعماله وحیاته الفردیة والجماعیة وتزکیتها.

والاشیاء التی اعتمد لها مصطلح الشریعة فی مضمونها هی العبادات، وأحکام طهارة البدن، وطهارة الطعام والشراب، وطهارة الاخلاق وتزکیتها، وکل هذه الاشیاء لیست للدنیا علی الإطلاق، بل مطلوب للآخرة. لقد قرر اللّٰه أن تکون جنته لاولئك الذین یزکون أنفسهم. وبعد هذا فإن الدین لا علاقة له بأی شیء آخر غیره.

ولذلك، إذا أردنا فهم شریعة اللّٰه، فسوف تُفهم من حیث غرضها وهدفها هذا لاغیر. کما أن الحکم بوجوبها یجب أن یتقرر بهذا المعنی، وتتحدد أیضًا درجتها ومرتبتها فی علوم الدنیا وفنونها اعتبارًا بهذه المیزة فقط. لذا أنظر کیف تناول الرب تعالی ذلك حین قال:

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَکِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَةَ وَاِنْ کَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ. (الجمعة ۶۲:۲)

نعیم احمد بلوچ

# حیاتِ امین

## (سوانح مولانا امین احسن اصلاحی)

(17)

[صاحب ”تدبر قرآن“ کی وصیت کے مطابق
ان کے سوانح نگار نعیم احمد بلوچ کے قلم سے]

جماعت اسلامی کے ساتھ 17 برس کی رفاقت (اگست 1941ء تا جنوری 1958ء) میں مولانا اصلاحی نے جماعت کا علمی محاذ سنبھالے رکھا۔ اس زمانے میں مولانا کے قلم سے معرکۃ الآرا علمی مقالات اور مضامین سامنے آئے۔ یہ سب جماعت کے ترجمان ماہنامہ ”ترجمان القرآن“ میں شائع ہوئے۔ ان تحریروں کو ہم تین اقسام میں تقسیم کر سکتے ہیں:

الف: مولانا اصلاحی کی علمی تصانیف کی اقساط۔

ب: وہ علمی مضامین اور تنقیدی مقالہ جات، جو معاصر اہل علم اور تنقید نگاروں کے جواب میں لکھے گئے۔

ج: ملکی و ملی حالات و واقعات پر ”اشارات“ کے عنوان سے ادارتی شذرات۔ یہ شذرات عام

طور پر مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی بہ طور مدیر تحریر فرماتے تھے۔ بعض اوقات علالت یا مولانا کی عدم دستیابی کی وجہ سے یہ ذمہ داری مولانا اصلاحی نے نبھائی۔

مولانا اصلاحی کی حسب ذیل کتب اس عرصہ میں بالاقساط شائع ہوتی رہیں:

1۔ ''تزکیۂ نفس''۔ اس کے کچھ حصے ماہنامہ ''الاصلاح'' میں شائع ہوئے اور باقی حصے ماہنامہ ''ترجمان القرآن'' میں۔

2۔ دعوت دین اور اس کا طریقۂ کار

3۔ اسلامی ریاست

## علمی موضوعات کی تفصیل

ان مضامین کی مختصر تفصیل اس طرح ہے:

1۔ ''حضرت موسیٰ علیہ السلام نیشنلِسٹ لیڈر تھے یا نبی اور رسول؟'' اس مضمون میں اس بات کو زیر بحث لایا گیا کہ مسلم لیگ کی طرف سے یہ کہا گیا کہ آج ہندستان کے لیے بنیادی مسئلہ آزادیِ ہند اور آزادیِ دنیاے اسلام کا ہے۔ یہ حصولِ آزادی کی کوئی عام سیاسی تحریک نہیں، بلکہ ایک مذہبی فریضہ ہے، جس کے لیے ان کی پوری اجتماعیت کو اپنا تن من دھن صرف کرنے کی ضرورت ہے۔ مولانا اصلاحی نے اس مضمون میں واضح کیا کہ یہ موقف درست نہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کوئی قومی لیڈر نہیں تھے، بلکہ وہ اللہ کے رسول اور نبی تھے۔ ان کا بنی اسرائیل کو فرعون سے نجات دلانے کے بعد فلسطین لے جانے کی جدوجہد کا ہندستان کی موجودہ سیاست سے کوئی تعلق نہیں۔ مسلم لیگ کی جدوجہد ایک سیاسی جدوجہد ہے اور اس سے اتفاق و اختلاف کیا جا سکتا ہے۔

2۔ ''سجدۂ تعظیم''۔ ماہنامہ ''ترجمان القرآن'' میں مولانا امین احسن صلاحی کے نام ایک صاحب نے عربی زبان میں خط لکھ کر دریافت کیا کہ آدم علیہ السلام کو فرشتوں کا سجدہ کرنا کیسا تھا؟ ان صاحب کے خیال میں یہ سجدۂ تحیہ تھا۔ صاحب مکتوب نے اس کے حق میں متعدد دلائل دیے۔ مولانا اصلاحی نے اس کا اصولی اور مفصل جواب تحریر کیا۔ مولانا کے موقف کا خلاصہ یہ تھا کہ یہ بحث اضافی ہے کہ یہ سجدۂ تعظیمی ہے یا عبودی۔ اسے اللہ تعالیٰ کا حکم سمجھ کر کیا گیا۔

3۔ ''سنتِ خلفاے راشدین''۔ اس مضمون میں خلفاے راشدین کے اقدام کے بارے میں بحث کی گئی تھی کہ ان اقدام کی کیا حیثیت ہے۔ مولانا اصلاحی نے اس موضوع کا احاطہ کرتے ہوئے واضح کیا کہ خلفاے راشدین کے اجتماعی فیصلے سنت رسول ہی کی طرح ہیں۔

4۔ ''حدیث کے متعلق چند سوالات''۔ اس زمانے کے بعض اہل علم نے حدیث کی دین میں حیثیت پر مختلف نکات اٹھائے۔ یہ مضمون اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا۔ بعد میں اس موضوع کو مولانا مودودی نے مکمل کیا اور ان کا یہ موقف ''سنت کی آئینی حیثیت'' میں دیکھا جا سکتا ہے۔ مولانا اصلاحی نے ان کے موقف سے اتفاق کیا، لیکن بعد میں انھوں نے حدیث اور سنت کے فرق کو مزید واضح کرنے کے ساتھ ساتھ ''مبادی تدبر حدیث'' کے نام سے باقاعدہ ایک کتاب تصنیف کی۔ یہ کتاب انھوں نے تفسیر ''تدبر قرآن'' لکھنے کے بعد مرتب کی۔ اس کتاب میں ان کی راے میں ارتقا دیکھا جا سکتا ہے۔

5۔ ''مسئلۂ تملیک اور زکوٰۃ سے متعلق بعض دوسرے مسائل''۔ ''ترجمان القرآن'' بابت محرم 1274ھ میں خان محمد صاحب ربانی کا ایک مضمون بہ عنوان ''حضرات علماے کرام کی خدمت میں چند سوالات'' شائع ہوا تھا۔ اس مضمون میں چند ایسے سوال اٹھائے گئے تھے، جو ادائیگی زکوٰۃ کے لیے تملیک کو رکن یا شرط قرار دینے کے سبب سے پیدا ہوتے ہیں۔ ان سوالوں کے جواب میں مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی کے دو مکتوب ''ترجمان القرآن'' بابت جمادی الاولیٰ 1374ھ میں شائع ہوئے ہیں۔ مولانا ظفر احمد صاحب نے اپنے مکاتیب میں ان اشکالات کا فقہ حنفی کی روشنی میں جواب دینے کی کوشش کی ہے، جو ربانی صاحب نے پیش کیے تھے۔ مولانا اصلاحی کو ان کی پیش کردہ بعض آرا سے اختلاف تھا۔ چنانچہ انھوں نے اس موضوع پر متعدد مضامین لکھے۔ یہ مضامین بعد میں ''مسئلۂ تملیک'' کے عنوان سے کتابی شکل میں بھی شائع ہوئے۔

6۔ ''الائمۃ من قریش''۔ اس مشہور اور متفق علیہ حدیث کے حوالے سے یہ موقف پیش کیا گیا کہ مسلمانوں کی سیاسی قیادت قریش ہی کر سکتے ہیں۔ اس پر مولانا اصلاحی نے بہت مسکت دلائل دیے اور اس بحث کو یہ کہہ کر ہمیشہ کے لیے مکمل کر دیا کہ حضور کا یہ فرمان اس قضیے کا فیصلہ تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلافت کا حق دار کون ہو گا۔ انھوں نے واضح کر دیا کہ یہ کوئی مستقل حکم نہیں تھا۔

7۔ ''ہم اس ملک میں کیا تغیُّرات چاہتے ہیں''۔ ان سلسلہ ہاے مضامین میں مولانا اصلاحی نے جماعت اسلامی کے موقف کو پیش کیا کہ پاکستان بننے کے بعد آئین سازی کے لیے کن حقائق کو سامنے رکھنا ضروری ہے اور معاشرے میں کون سی تبدیلیاں ان کے نزدیک ضروری ہیں۔

8۔ ''نئی فرد قرار داد جرم''۔ یہ مضمون اور اس طرح کے دوسرے مضامین مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور جماعت اسلامی پر تنقیدات کا جواب ہیں۔ ان کے مندرجات کا ایک تفصیلی تعارف پچھلے صفحات میں گزر چکا ہے۔

9۔ ''عائلی کمیشن کی رپورٹ پر تبصرہ''۔ یہ سلسلہ ہاے مضامین مولانا کی تصنیف ''جدید اسلامی ریاست میں قانون سازی'' کا ایک حصہ ہے۔ کتاب کا تیسرا حصہ عائلی کمیشن کی رپورٹ پر مولانا کے مفصل تبصرے پر مبنی ہے۔ مولانا نے یہ تبصرہ اس عائلی کمیشن کی رپورٹ پر کیا تھا، جو 1955ء میں پاکستان کی مرکزی حکومت کی طرف سے مسلمانوں کے عائلی مسائل و قوانین کا جائزہ لینے اور اس کے بارے میں تجاویز و سفارشات پیش کرنے کے لیے قائم کیا گیا تھا۔ اس کمیشن کی رپورٹ پر علما اور عوام، دونوں کی طرف سے بہت احتجاج کیا گیا تھا۔ مولانا نے اس رپورٹ پر مفصل بحث کے ساتھ اس میں موجود غلطیوں کی نشان دہی کی ہے۔ اس رپورٹ کو تیار کرنے والے افراد میں سے بعض مغرب کے عائلی اور ازدواجی قانون سے متاثر و مرعوب تھے، مولانا نے ان افراد کے تصورات کی کجی کو نمایاں کیا، ان کی پیش کردہ تجاویز و سفارشات پر کڑی تنقید کی اور عائلی اور ازدواجی قانون کے حوالے سے اسلام کے صحیح نقطۂ نظر کو بیان کیا ہے۔ کتاب کا تیسرا حصہ کسی زمانے میں علیحدہ سے بھی شائع ہوا تھا، جو کتابی شکل میں اب نایاب ہے، البتہ مذکورہ کتاب میں اسے دیکھا جا سکتا ہے۔

## اشارات

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے کہ یہ اصل میں ماہنامہ ''ترجمان القرآن'' کے ادارتی شذرات ہیں۔ ان میں بیان کردہ آرا کی ہمارے نزدیک بہت اہمیت ہے۔ ان کے تفصیلی ذکر سے ہم جان پائیں گے کہ

الف: مولانا اصلاحی اور جماعت اسلامی کا تقسیم ہند پر کیا موقف تھا۔ وہ مسلم لیگ کے تقسیم

ہند کے موقف سے کس قدر متفق تھے اور اس سے کس نوعیت کا اختلاف رکھتے تھے۔

ب: تقسیم ہند کے موقع پر پورا برصغیر فسادات اور خوف ناک قتل وغارت گری کی لپیٹ میں آ گیا تھا۔ ان فسادات میں محتاط اندازے کے مطابق دونوں جانب کے سوا کروڑ لوگ لقمۂ اجل بنے۔ اس موقع پر جماعت اسلامی نے ایک خاص موقف اختیار کیا تھا۔ یہ موقف باقی تمام سیاسی اور مذہبی جماعتوں اور گروہوں سے بالکل ممتاز تھا۔ اس بہت منفرد اور صائب نقطۂ نظر کا ذکر تاریخی طور پر محفوظ ہونا چاہیے۔ اس لیے اس کا بہ طور خاص ذکر کیا جا رہا ہے۔

ج: پاکستان کے قیام کے بعد مولانا اصلاحی کم و بیش دس برس تک جماعت اسلامی کے رکن رہے۔ اس حیثیت سے ان کے افکار و نظریات کیا ہیں؟ یہ مضامین اس حوالے سے مولانا کے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہیں۔ ان کا اجمالی جائزہ بھی مفید ہو گا۔

[باقی]

# خیال و خامہ

جاوید احمد غامدی

ہم نے مانا کہ یہاں اب کوئی بیداد نہیں
دیکھتے ہو کہ کسی لب پہ بھی فریاد نہیں

زخمہ ور، شوکتِ پرویز کا نغمہ ہر سو
ہر طرف جشن کہ اب شہر میں فرہاد نہیں

سگِ آوارہ تو بستی میں کھلے ہیں، لیکن
حادثہ یہ ہے کہ پتھر کوئی آزاد نہیں

اب تو فردوسِ تخیل میں بھی مشکل ہے کہ ہو
وہ نشیمن کہ جہاں گھات میں صیاد نہیں

راہِ تقلید نہیں، دونیِ ہمت ہے فقط
وہ سفر کیا ہے جسے خطرۂ افتاد نہیں

ہر نفس زندہ و بیدار عنایت اُس کی
تم اُسے یاد ہو، پر تم کو خدا یاد نہیں

دشت و صحرا ہی سے نسبت ہے تجلی کو اگر
دل کا ویرانہ بھی غرناطہ و بغداد نہیں

---

اِسی فقیر کا یہ حلقۂ سخن ہے جہاں
عجب نہیں کہ ہوں فطرت کے رازداں پیدا



شاہد محمود

# خبر نامہ ”المورد امریکہ“

## [جنوری 2025ء]

### ”المورد“ امریکہ کا سالانہ اجلاس

گذشتہ ماہ ڈیلس میں ”المورد“ امریکہ کے اراکین کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا۔ یہ اجلاس دو روز تک جاری رہا اور اس میں جنرل باڈی کے تمام اراکین نے شرکت کی۔ ”المورد“ امریکہ کے سیکرٹری علی فاروق صاحب نے چیئر مین ”المورد“ بورڈ جناب مکرم عزیز کو مرکزی اجلاس کے آغاز کے افتتاحی خطاب کی دعوت دی۔ اُنھوں نے بورڈ کی طرف سے شرکا کو خوش آمدید کہا اور اپنی اور بورڈ کی جانب سے ادارے کی تعمیر و ترقی کے لیے بھرپور کام کرنے کے عزم کا اظہار کیا۔ مکرم عزیز صاحب نے سال 2024ء کے مالی امور کے حوالے سے تفصیلی رپورٹ بھی پیش کی۔ ”المورد“ یو ایس کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر اور سی ای او جناب فرحان سید نے ادارے کی سالانہ کارکردگی رپورٹ پیش کرنے کے بعد غامدی جی پی ٹی، آن لائن تعلیمی کورسز، اے آئی ڈبنگ، انگریزی کونٹینٹ اور کتابوں کی اشاعت و فروخت کے حوالے سے کاموں کی تفصیل بھی بیان کی۔ شرکا نے کارکردگی کو سراہا اور کہا کہ محدود ٹیم کے ساتھ غیر معمولی کام انجام دینا لائق تحسین ہے۔ اس

کے بعد ایجوکیشن کمیٹی کے ممبر جناب عاطف ساجد نے ”سنڈے اسکول“ کے حوالے سے تعلیمی کارکردگی کی سالانہ رپورٹ پیش کی۔ عمیر اجمل صاحب نے آئی ٹی سے متعلق معاملات کی تفصیل بتائی۔

غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ کے ڈائریکٹر ریسرچ اینڈ کمیونیکیشن محمد حسن الیاس صاحب نے ادارے کے اہداف و مقاصد اور لائحۂ عمل کو بیان کرتے ہوئے کہا کہ ہماری یہ شعوری کوشش ہے کہ لوگوں کو بار بار یہ یاددہانی کرائی جائے کہ ہم کسی مسلک، فرقے یا خاص زاویے سے مذہب کی دنیا بھر میں ترویج کر کے اپنا کوئی جتھا بنانے والی مذہبی تنظیم نہیں ہیں، بلکہ ہماری بنیادی شناخت بھی وہی ہے، جو دنیا بھر میں عام مسلمانوں کی ہے اور یہ ادارہ امت مسلمہ کی علمی روایت کے تسلسل میں کھڑا ہے۔ مزید برآں، انھوں نے ڈیجیٹل کانٹینٹ، سوشل میڈیا، آڈیو بکس، ڈاکومینٹریز، رسالے، اردو، انگریزی اور عربی زبان میں کتابوں کی تیاری اور پروگراموں کی ریکارڈنگ کے حوالے سے گذشتہ برس سرانجام دی جانے والی سرگرمیوں کے بارے میں بتایا۔

جناب جاوید احمد غامدی نے ”المورد“ امریکہ سے وابستہ افراد کے کاموں کو سراہتے ہوئے ان کے لیے دعائیہ کلمات کہے۔ اپنے حالیہ اور مستقبل کے علمی و تصنیفی منصوبوں کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اس وقت ہماری نئی نسل الحاد سے بہت متاثر ہو رہی ہے، اس لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ ”23 اعتراضات سیریز“ کی طرح الحاد کے موضوع پر بھی ایک سیریز کی جائے، لہٰذا یہ چیز ان کے پیش نظر ہے کہ 23 اعتراضات کی ویڈیو سیریز کی تکمیل کے بعد وہ الحاد کے موضوع پر بھی باقاعدہ ایک ویڈیو سیریز ریکارڈ کرائیں گے۔

## غامدی صاحب کا دورۂ بحرین

گذشتہ ماہ پاکستان سے واپسی پر غامدی صاحب نے بحرین میں دو روز قیام کیا۔ غامدی سینٹر کے ڈائریکٹر ریسرچ اینڈ کمیونیکیشن محمد حسن الیاس صاحب بھی ان کے ہم راہ تھے۔ بحرین میں قیام کے دوران میں غامدی صاحب نے مختلف مجالس میں شرکت کی، جہاں لوگوں نے ان سے دینی اور سماجی موضوعات سے متعلق سوالات پوچھے، بالخصوص مولانا مودودی کے فکر کے بارے میں سوالات پوچھے گئے۔ مزید برآں، صوفیانہ اور سلفی تعبیرات کو بھی زیر بحث لایا گیا۔

## ''المورد'' ہند کے حلقۂ احباب کے ساتھ آن لائن نشست

دسمبر 2024ء میں غامدی صاحب اور جناب حسن الیاس نے ''المورد'' ہند کے احباب کے ساتھ ایک آن لائن نشست میں شرکت کی۔ یہ سوال و جواب پر مبنی ایک سیشن تھا، جس میں جماعت اسلامی ہند کے بعض رفقا نے بھی شرکت کی۔ شرکا نے غامدی صاحب اور حسن الیاس صاحب سے مختلف علمی و فکری سوالات پوچھے۔ یہ نشست تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک جاری رہی۔

## ''وائس آف ریسرچ''

غامدی سینٹر نے تحقیقی اور علمی ماحول کے فروغ کے لیے ''وائس آف ریسرچ'' کے نام سے آن لائن سیمینار کا سلسلہ شروع کیا ہے، جہاں محققین اور اسکالرز اپنی تحقیق پیش کر سکیں گے۔ اس سیمینار کا مقصد تحقیقی مزاج، مکالمے کے فروغ اور تنقیدی سوچ کے ذریعے سے تحقیقی ماحول پیدا کرنا ہے۔ گذشتہ ماہ اس سیمینار میں ڈاکٹر عمار خان ناصر نے ''توہین رسالت کا مسئلہ'' کے موضوع پر علمی و فکری گفتگو کی اور لوگوں کی طرف سے پوچھے جانے والے سوالات کے جواب دیے۔ یہ سیمینار آن لائن رابطے کی ایک ایپ زوم پر ہوتا ہے، دل چسپی رکھنے والے حضرات ان سیمینارز میں براہ راست شرکت کر کے اپنے سوالات پوچھ سکتے ہیں۔

## ارشد محمود صاحب کی غامدی سینٹر آمد

غامدی سینٹر کی یہ خواہش ہے کہ فنون لطیفہ کے حوالے سے ہمارے معاشرے میں جو مذہبی حساسیت پائی جاتی ہے، اس کو ختم کیا جائے۔ چنانچہ اسی مقصد کے پیش نظر پاکستان کے معروف فنکار و موسیقار جناب ارشد محمود کو غامدی سینٹر مدعو کیا گیا۔ اس موقع پر انھوں نے حسن الیاس صاحب کے ساتھ ایک پروگرام بھی ریکارڈ کرایا، جس میں فنون لطیفہ کے مختلف پہلوؤں کے علاوہ ان کی ذاتی زندگی کے بارے میں بات کی گئی۔ مزید برآں، انھوں نے غامدی صاحب کی علمی و فکری خدمات کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار بھی کیا۔ اس پروگرام کی ریکارڈنگ غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر دیکھی جا سکتی ہے۔

## تعلیمی ایکسپو، اورنگ آباد میں ''المورد'' ہند کی شرکت

دسمبر 2024ء میں ''المورد'' ہند نے اورنگ آباد، انڈیا میں تعلیمی ایکسپو میں اپنا بک اسٹال لگایا۔ اس بک اسٹال میں ''المورد'' ہند کی مطبوعات کے ساتھ غامدی سینٹر کی کتب بھی رکھی گئیں۔ لوگوں کی ایک بڑی تعداد نے اس بک اسٹال کا وزٹ کیا اور کتابیں خریدیں۔

## غامدی سینٹر کا دس روزہ خانقاہ پروگرام

دسمبر 2024ء میں غامدی سینٹر کے زیر اہتمام دس روزہ خانقاہ کے پروگرام کا انعقاد کیا گیا۔ معز امجد صاحب نے اس میں بہ طور معلم اپنی خدمات پیش کیں۔ اس پروگرام میں ''غصہ اور رد عمل پر کنٹرول''، ''وقت کا صحیح استعمال''، ''بچوں کی تربیت''، ''گھر اور نوکری میں توازن'' اور ''مقصد زندگی کی تلاش'' جیسے اہم موضوعات کو زیر بحث لایا گیا۔ یہ پروگرام 21 دسمبر 2024ء سے 30 دسمبر 2024ء تک جاری رہا اور لوگوں کی کثیر تعداد نے اپنے بچوں کے ساتھ اس پروگرام میں شرکت کی۔

## ''دین میں علم و استدلال کے بنیادی اصول''

منظور الحسن صاحب نے اپنے اس مضمون میں دین میں علم و استدلال کے دو ایسے بنیادی اصول بیان کیے ہیں، جو عقل و نقل کے مبادیات کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کے بغیر دین و شریعت کے صحیح فہم تک رسائی ناممکن ہے۔ پہلا اصول بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ دین میں قرآنِ مجید کی حیثیت میزان اور فرقان کی ہے۔ چنانچہ احادیث و آثار، تاریخ و سیرت، فقہ و تفسیر کے ہر قول، ہر روایت اور ہر رائے کو اِس کی کسوٹی پر پرکھا جائے گا۔ دوسرا یہ کہ قرآنِ مجید صاف اور واضح عربی زبان میں نازل ہوا ہے۔ یہ اپنا مدعا پوری صراحت کے ساتھ پیش کرتا ہے، جسے اہل علم کو سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ انھوں نے روایتی مکاتب میں فکر و نظر کی بیش تر غلط فہمیوں کا باعث اِنھی اصولوں سے گریز کو قرار دیا ہے۔ یہ مضمون ''اشراق امریکہ'' کے دسمبر 2024ء کے شمارے میں پڑھا جا سکتا ہے۔

## ''تفہیم الآثار'' سیریز

غامدی سینٹر کے زیر اہتمام ''تفہیم الآثار'' سیریز کے زیر عنوان گذشتہ ماہ منعقد ہونے والے پروگراموں میں تلاوت قرآن مجید کے حوالے سے آثار کا مطالعہ کیا گیا، جن میں ''قرآن مجید کی تلاوت کتنے عرصے میں ختم کی جائے؟''، ''تلاوت کرتے ہوئے آیات کا جواب دینا''، ''دوران تلاوت میں کچھ آیات کو بار بار پڑھنا'' اور ''تلاوت قرآن مکمل ہونے پر دعا کا اہتمام'' جیسے اہم نکات پر گفتگو کی گئی۔ ان نشستوں کی ریکارڈنگ غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

## ''جماعت اسلامی: ماضی، حال اور مستقبل''

یہ موضوع غامدی سینٹر کے زیر اہتمام ہونے والی ہفتہ وار سوال وجواب کی لائیو نشستوں میں زیر بحث رہا ہے۔ اس موضوع کے تحت جماعت اسلامی کے ماضی، حال اور مستقبل اور مولانا مودودی کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ 13 نشستوں پر مبنی اس طویل بحث کو حال ہی میں مکمل کیا گیا ہے۔ ان نشستوں میں ''جماعت اسلامی کی تاریخ اور چیلنجز''، ''قرار داد مقاصد، جماعت کی اہم کامیابی'' اور ''مودودی صاحب کی سزاے موت کا فیصلہ'' اور دیگر اہم موضوعات کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ ان نشستوں کی ریکارڈنگ ادارے کے یوٹیوب چینل پر ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

## ''اسلام اسٹڈی سرکل''

دسمبر 2024ء میں شہزاد سلیم صاحب نے ''اسلام اسٹڈی سرکل'' پروگرام میں قرآن مجید، حدیث اور بائیبل کے جن موضوعات پر بات کی، ان کے عنوانات بالترتیب یہ ہیں: ''اللہ کی قربت حاصل کرنا''، ''دولت ایک آزمایش ہے'' اور ''دوسروں کی مدد کرنا''۔ مزید برآں، نشست کے آخر میں ''نفرت کا مقابلہ کرنا'' کے موضوع پر گفتگو کی گئی اور زیر بحث آنے والے موضوعات سے متعلق پوچھے جانے والے سوالوں کے جواب دیے گئے۔ اس نشست کی ریکارڈنگ غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

## ''جماعت اسلامی پر تنقید کی وجوہات''

''حیات امین'' کی گذشتہ ماہ شائع ہونے والی قسط میں نعیم بلوچ صاحب نے ابتدا میں جماعت اسلامی پر ہونے والی تنقید کی وجوہات کو بیان کیا ہے اور اس ضمن میں متعدد اہل علم کی آرا کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ جماعت اسلامی پر تنقید کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ مولانا مودودی نے پہلی دفعہ اسلامی حکومت کے قیام کو دینی فریضہ قرار دیا تھا۔ پھر طرہ یہ کہ اسی نقطۂ نظر کی بنیاد پر مودودی صاحب نے اپنی کتاب ''تجدید و احیائے دین'' تصنیف کی، جس میں مولانا نے یہ موقف اختیار کیا کہ اس سے پہلے دین کے احیا کی جتنی بھی کوششیں ہوئی ہیں، وہ اس فریضے کی انجام دہی کے بارے میں مکمل طور پر غافل رہی ہیں یا اسے وہ اہم مقام نہیں دیا گیا، جس کا یہ فریضہ متقاضی ہے۔ یہ مضمون ''اشراق امریکہ'' کے دسمبر 2024ء کے شمارے میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

## ''موت کی سزا''

غامدی سینٹر کے زیر اہتمام جاری 23 اعتراضات کی ویڈیو سیریز میں ''موت کی سزا'' کے عنوان سے ایک نئے موضوع کا آغاز کیا گیا ہے۔ گذشتہ ماہ اس سلسلے کی منعقد ہونے والی نشستوں میں غامدی صاحب نے اپنے اس نقطۂ نظر کے حق میں دلائل پیش کیے کہ دین اسلام میں قتل اور فساد فی الارض کے علاوہ موت کی سزا نہیں دی جا سکتی۔ مزید برآں، اس موقف کے حق میں پیش کی جانے والی آیت کا پس منظر اور اس کے مخاطبین کے حوالے سے گفتگو کی گئی اور اس پر علما کی جانب سے کیے جانے والے اعتراضات کو زیر بحث لایا گیا۔ ان نشستوں کی ریکارڈنگ کو غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر دیکھا جا سکتا ہے۔

## غامدی صاحب کی ہفتہ وار سوال و جواب کی نشستیں

غامدی سینٹر کے زیر اہتمام ہر ہفتے سوال و جواب کی لائیو نشست منعقد کی جاتی ہے، جس میں حسن الیاس صاحب غامدی سینٹر کو موصول ہونے والے مختلف نوعیت کے سوال غامدی صاحب

کے سامنے رکھتے ہیں اور غامدی صاحب ان کا جواب دیتے ہیں۔ دسمبر 2024ء میں ان نشستوں میں شام میں ہونے والی حالیہ بغاوت کے مختلف پہلوؤں پر بات کی گئی۔ مزید برآں، ''جبر و استبداد کی بنا پر قائم کی گئی حکومت کے بارے میں اسلام کیا کہتا ہے''، ''خوارج کون تھے''، ''جمہوری حکومت میں سول نافرمانی اور بغاوت کرنے والوں پر فساد فی الارض کی سزا کا اطلاق کیا جا سکتا ہے؟'' اور ''کن حالات میں بغاوت کی جا سکتی ہے؟'' جیسے اہم سوالات کو زیر بحث لایا گیا۔ سوال و جواب کی ان نشستوں کی ریکارڈنگ ادارے کے یوٹیوب چینل پر ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

## ''مطالعۂ سیرت'' کی آڈیو ریکارڈنگ

یہ کتاب مولانا وحید الدین خان کی تصنیف ہے۔ ڈاکٹر خالد ظہیر نے اسے اپنی آواز میں ریکارڈ کرایا ہے، جسے غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر سلسلہ وار نشر کیا جا رہا ہے۔ اب تک اس کی 15 اقساط نشر ہو چکی ہیں، جن کو غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر دیکھا جا سکتا ہے۔

## ''البیان'' کی انگریزی زبان میں تدریس

گذشتہ ماہ شہزاد سلیم صاحب نے غامدی صاحب کی تفسیر ''البیان'' میں سے سورۂ نساء کی آیات 23 تا 59 کا انگریزی زبان میں درس دیا۔ ان نشستوں کی ریکارڈنگ غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر موجود ہے۔

## ہفتہ وار درسِ قرآن و حدیث

دسمبر 2024ء میں غامدی سینٹر کے زیر اہتمام جناب جاوید احمد غامدی کے لائیو درسِ قرآن و حدیث کی نشستوں میں غامدی صاحب نے سورۂ مریم کی آیات 37 تا 88 کا درس دیا، جب کہ درس حدیث کی نشستوں میں ''یاجوج و ماجوج کا فتنہ''، ''یاجوج و ماجوج کا خروج''، ''قیامت اور نزول مسیح کا معاملہ''، ''قرب قیامت کی 10 بڑی نشانیاں'' اور ''خروجِ دجال کا پس منظر'' جیسے اہم موضوعات سے متعلق احادیث پر گفتگو کی گئی۔ قرآن و حدیث کے دروس کی یہ نشستیں غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر دیکھی جا سکتی ہیں۔

## ”اصل الاصول“

دسمبر 2024ء میں شہزاد سلیم صاحب نے میزان لیکچرز سیریز کے تحت ”اصل الاصول“ کے موضوع پر انگریزی زبان میں دو لیکچرز ریکارڈ کرائے۔ ان لیکچرز کی ریکارڈنگ کو غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر دیکھا جاسکتا ہے۔

## غامدی سینٹر کے آن لائن تعلیمی کورسز

دسمبر 2024ء میں غامدی سینٹر نے اپنے آن لائن لرننگ پلیٹ فارمز Udemy اور Teachable کے لیے انگریزی زبان میں دو کورسز شائع کیے، جن کے نام یہ ہیں: ”Principles of Understanding the Qur'an“ اور ”Morals & Morality“۔ پہلا کورس Teachable اور Udemy، دونوں پلیٹ فارمز پر موجود ہے اور اس کو شہزاد سلیم صاحب نے ریکارڈ کرایا ہے، جب کہ دوسرا کورس صرف Teachable پر موجود ہے اور اس کی آڈیو AI کے ذریعے سے تیار کی گئی ہے۔ واضح رہے کہ غامدی سینٹر کے آن لائن کورسز کو منفرد اور دل چسپ بنانے کے لیے ویڈیوز کو جدید انداز میں ایڈٹ کیا جاتا ہے۔ یہ کورسز غامدی سینٹر کی Teachable ویب سائٹ اور Udemy پر نہایت کم قیمت میں دستیاب ہیں۔

## شہزاد سلیم صاحب کے آن لائن نجی مشاورتی سیشن

شہزاد سلیم صاحب ہر ماہ لوگوں سے آن لائن نجی مشاورتی سیشن کا اہتمام کرتے ہیں۔ ان سیشنز میں لوگ اپنے مختلف ذاتی اور خاندانی نوعیت کے مسائل میں شہزاد سلیم صاحب سے مشاورت کرتے ہیں۔ گذشتہ ماہ اس سلسلے کے 20 سے زائد سیشنز ہوئے۔ ان سیشنز میں لوگوں نے شہزاد سلیم صاحب سے والدین کو درپیش مشکلات اور نوعمری کے مسائل کے حل کے لیے مشاورت کی۔

## ”علم و حکمت: غامدی کے ساتھ“

گذشتہ ماہ دنیانیوز پر نشر ہونے والے غامدی صاحب کے ہفتہ وار پروگرام کے موضوعات یہ تھے: ”غامدی صاحب کے تصور سنت پر اشکالات کا جائزہ“، ”مسلمانوں پر افلاطون کے فکری

اثرات" اور "اسلام میں اقلیتوں کے حقوق"۔ ان پروگراموں میں زیر بحث آنے والے سوالوں میں سے چند اہم سوالات یہ ہیں: "کیا سائنس یا فلسفے وغیرہ سے اسلام کی توجیہ و توضیح کرنا درست ہے؟"، "کوئی چیز بدعت کیسے قرار پاتی ہے؟"، "سنت کی تصدیق کے عمل میں حدیث معیار بنے گی یا فقہ؟" اور "دعا کو سنت کی فہرست میں شامل کیوں نہیں کیا گیا؟" ان پروگراموں کی ریکارڈنگ ادارے کے یوٹیوب چینل پر دیکھی جا سکتی ہے۔

## Ask Dr. Shehzad Saleem

یہ سوال و جواب کی لائیو ماہانہ نشست ہے، جس میں ڈاکٹر شہزاد سلیم لوگوں کے ذہنوں میں اٹھنے والے مختلف دینی، اخلاقی اور معاشرتی موضوعات سے متعلق سوالوں کے جواب دیتے ہیں۔ اس نشست میں لوگ اردو اور انگریزی، دونوں زبانوں میں اپنے سوال پوچھ سکتے ہیں۔

## دینی آرا پر مبنی فتاویٰ کا اجرا

شریعت کے قانونی اطلاقات کے حوالے سے لوگ اکثر غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ، امریکہ سے رابطہ کرتے ہیں۔ انھیں نکاح و طلاق، وراثت (inheritance) اور بعض دیگر معاشی اور معاشرتی پہلوؤں سے اطلاقی آرا کی ضرورت ہوتی ہے۔ گذشتہ ماہ اسی نوعیت کی مختلف ضرورتوں کے تحت 5 فتوے جاری کیے گئے۔ انھیں جناب جاوید احمد غامدی کے فکر کی روشنی میں حسن الیاس صاحب نے جاری کیا۔

## شہزاد سلیم صاحب کے مختلف موضوعات پر لیکچرز کی ریکارڈنگ

شہزاد سلیم صاحب ہر ماہ دینی، اخلاقی اور سماجی موضوعات پر انگریزی زبان میں لیکچرز ریکارڈ کراتے ہیں۔ دسمبر 2024ء میں انھوں نے جن موضوعات پر لیکچرز ریکارڈ کرائے، وہ یہ ہیں: "بہ طور انسان کیسے ممتاز ہوا جائے؟" اور "انسانیت"۔ ان لیکچرز کو غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر دیکھا جا سکتا ہے۔